قرآنی نظامِ ربوبیت کا نقیب

طلوعِ اسلام

نومبر 1982

اس پرچہ میں

قوموں کی تعمیر فکر سے ہوتی ہے

نہ ہنگاموں سے نہ تعزیرات سے

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ لاہور

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

بدلِ اشتراک	ٹیلی فون	قیمت فی پرچہ
سالانہ پاکستان -/۳۶ روپے غیر ممالک -/۸۶ ؍؍	۸۸۰۸۰۰ خط و کتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور	۳ تین روپے
جلد ۳۵	نومبر ۱۹۸۲ء	شمارہ ۱۱

فہرست

۱۔ لمعات ---------------------- ۲

۲۔ باب المراسلات، مسجد اقصیٰ کی حقیقت ---------------------- ۳

۳۔ نقد و نظر ---- (ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب کی نئی کتاب) ---------- ۱۱

۴۔ قرآنک کالج ---------- (چیئرمین قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی) ---------- ۱۲

۵۔ قرآنی درس کے اعلانات ---------------------- ۱۴

۶۔ اسلام — دورِ ملوکیت میں ---------- (غلام اور لونڈیاں) ---------- ۱۵

۷۔ قوموں کی تعمیر فکر سے ہوتی ہے ---- (نہ ہنگاموں سے، نہ تعزیرات سے) ---------- ۲۵

(محترم پرویز صاحب)

۸۔ اور کر دو قرآن کی بات! ---------------------- ۵۳

(۰)

ایڈیٹر محمد خلیل۔ ناشر شیخ عبدالحمید مقامِ اشاعت ۔ ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور۔ مطبوعہ ۔ اشرف پرنٹنگ پریس ۹ رایبک روڈ ۔ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

(سو سوالوں کا ایک جواب)

گذشتہ پینتیس سالوں میں نظریۂ پاکستان اور اسلامی نظام کے الفاظ لاکھوں کروڑوں مرتبہ دھرائے گئے۔ لیکن کسی نے یہ نہ بتایا کہ نظریۂ پاکستان کا مفہوم کیا ہے، اور کسی نظام کے اسلامی یا غیر اسلامی قرار پانے کا معیار کیا۔ یہ تصورات اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ کے پیش کردہ تھے اور انہوں نے ان کا مفہوم اور مطلوب نہایت واضح الفاظ میں بیان کر دیا تھا۔ ایک حصہ لا ـــــ کہ کیا چھوڑنا چاہیئے۔ اور دوسرا حصہ إلا کہ کیا اختیار کرنا چاہیئے۔ اقبالؒ نے کہا تھا:-

تمہارے دین کی یہ بلند فطری ملاؤں اور فقیہوں کے فرسودہ اوہام میں جکڑی ہوئی ہے اور آزادی چاہتی ہے۔ روحانی اعتبار سے ہم حالات اور جذبات کے ایک قید خانے میں محبوس ہیں جسے صدیوں کی مدت میں ہم نے اپنے گرد خود تعمیر کر رکھا ہے۔ ہم بڑھوں کے لئے شرم کا مقام ہے کہ ہم نوجوانوں کو ان انتقادی، سیاسی بلکہ مذہبی بحرانوں ..... کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ بنا سکے جو زمانہ حاضر میں آنے والے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ساری قوم کی موجودہ ذہنیت کو یکسر تبدیل کر دیا جائے تاکہ وہ پھر نئی آرزوؤں، نئی تمناؤں اور نئے نصب العین کی امنگ کو محسوس کرنے لگ جائے۔ (خطبۂ صدارت آل انڈیا مسلم کانفرنس ۱۹۳۲ء)

اور حصہ إلا کے متعلق قائدِ اعظمؒ نے ۱۹۴۷ء میں حیدر آباد (دکن) میں طلبا کے ایک سوال کے جواب میں فرمایا:-

اسلامی مملکت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا واحد ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ کسی پارلیمان کی، نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست یا معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت، دوسرے الفاظ میں، قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لئے آپ کو علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔

یہ لا اور إلا مل کر نظریۂ پاکستان بن جاتے ہیں اور یہی اسلامی اور غیر اسلامی کا معیار ہیں۔ اگر قرآن کے ساتھ کچھ اور شامل کر دیا جائے تو وہ شرک ہو جائے گا کیونکہ خود خدا کا ارشاد ہے کہ: لَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا ... (۱۸/۲۶) وہ اپنے حقِ حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے، پیش آمدہ معاملات کا، باہمی مشاورت سے، حل تلاش کرنا، اسلامی نظام ہے۔

جو لوگ قائدِ اعظمؒ اور اقبالؒ کے نقوشِ قدم پر چلنے کی تلقین کریں ان سے کہیئے کہ اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ کے نقوشِ قدم تو ہیں۔ آپ کس حد تک ان کی پیروی کر رہے ہیں جو دوسروں کو ان کے اتباع کی تلقین کرتے ہیں؟

بابُ المراسلات

مسجدِ اقصیٰ اور یہودیوں کا دعویٰ

سوال:۔ جب حکومتِ اسرائیل کا قطعہ پہلے پہل پیدا ہوا تھا تو یہودیوں نے کہا تھا کہ بیت المقدس میں ان کی عبادت گاہ ـــــ ہیکل سلیمانی ـــــ تھی جس کی جگہ مسلمانوں نے اپنی مسجد بنا لی۔ اس بنا پر ان کا دعویٰ تھا کہ بیت المقدس کے اصلی حقدار یہودی ہیں، مسلمان غاصب ہیں۔

اگرچہ یہودیوں نے بعد میں اپنے دعویٰ کو بندوق کے زور سے منوا لیا، لیکن آئینی اور قانونی نقطۂ نگاہ سے اس کی اہمیت اپنے مقام پر ہے۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ ہماری (یعنی مسلمانوں کی) طرف سے اس کا کیا جواب دیا گیا تھا۔ کیا آپ اس پر روشنی ڈالیں گے، بالخصوص اس لئے کہ بیت المقدس کے مسئلہ نے بڑی اہمیت حاصل کر رکھی ہے۔

جواب:۔ ہماری مذہبی پیشوائیت کی طرف سے، یہودیوں کے اس دعویٰ کے جواب میں جو کچھ کہا جاتا ہے، وہ ان کے دعویٰ کی حرف بحرف تصدیق بلکہ توثیق کر دیتا ہے۔

طلوعِ اسلام میں بالعموم، اور پرویز صاحب کی تصانیف میں بالخصوص، اس موضوع پر بڑی تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ اس سوال کے جواب میں اسے اختصاراً پیش کیا جاتا ہے۔ ان حضرات کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ

(۱) نبوت سے سرفراز ہونے کے بعد، حضور نبی اکرمؐ، مکہ کی تیرہ سالہ زندگی میں اور ہجرت کے بعد قریب دو سال تک مدینہ میں، کعبہ کے بجائے، بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز ادا فرماتے رہے جہاں ہیکلِ سلیمانی تھا۔ اس اعتبار سے اسے مسلمانوں کا قبلۂ اوّل کہہ کر پکارا جاتا ہے۔

رسول اللہؐ کے زمانے میں بیت المقدس میں یہودیوں کے معبد کی موجودگی کی یہ پہلی دلیل ہے۔

(۲) سورۂ اسرائیل کی پہلی آیت ہے۔ سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصٰی..... (اس کا مروجہ ترجمہ ہے) "پاک ہے

وہ ذات جو اپنے بندے کو راتوں رات، مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ کی طرف لے گیا" احادیث کی رو سے، اس کی تفسیر میں کہا جاتا ہے کہ اس میں مسجدِ حرام سے مراد کعبہ ہے اور مسجدِ اقصیٰ سے مراد بیت المقدس میں یہودیوں کی پرستش گاہ، ہیکل سلیمانی۔

یہ یہودیوں کے معبد کے وجود کی دوسری دلیل، بلکہ سند ہے۔ اسے مسجد کہہ کر پکارا گیا ہے۔

(۳) احادیث میں ہے کہ شبِ معراج میں بیت المقدس کی اسی مسجدِ اقصیٰ میں، ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاءؑ نے حضورؐ کی امامت میں نماز ادا فرمائی۔ یہیں سے حضورؐ آسمانوں کی طرف تشریف لے گئے اور پھر وہیں مراجعت فرمائی۔

یہ اس دلیل کی تائیدِ مزید ہے۔

اور یہ واقعہ ہے کہ اب وہاں یہودیوں کی کوئی عبادت گاہ نہیں۔ اس کی جگہ مسلمانوں کی مسجد ہے جسے ——— مسجدِ اقصیٰ کہہ کر پکارا جاتا ہے۔

ان واقعات کی روشنی میں جنہیں خود مسلمانوں کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے، یہودیوں کے دعویٰ کے حق بجانب ہونے میں کیا شبہ رہ جاتا ہے؟ وہ مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ

(i) تمہارا یہ عقیدہ ہے (جو ایمان کی حد تک پہنچا ہوا ہے) کہ نبی اکرمؐ کی زندگی میں، بیت المقدس میں ہمارا معبد موجود تھا۔

(ii) آپ کے رسولؐ اور صحابہؓ نے ہمارے معبد کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھی۔ اس سے تم یہ دعویٰ کرتے ہو کہ اس معبد پر سے ہماری ملکیت ساقط ہو گئی اور وہ تمہاری ملکیت میں چلا گیا۔ کیا کوئی عدالت تمہاری اس دلیل کو قابلِ پذیرائی قرار دے گی؟

(iii) تم نے اس معبد کی جگہ اپنی مسجد تعمیر کر لی۔ کیا یہ غصب نہیں؟

ہماری مذہبی پیشوائیت کے پاس ان کے ان دلائل کا کوئی جواب نہیں۔

اگر ہم عقیدت مندانہ جذبات سے ہٹ کر، حقائق پر غور کریں تو یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ جن روایات کی بنا پر مندرجہ بالا صغریٰ کبریٰ قائم کیا جاتا ہے وہ یہودیوں کی وضع کردہ ہیں (صاف نظر آتا ہے کہ) انہوں نے انہیں اس زمانے میں وضع کیا تھا جب اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان نے ۷۲ھ میں، بیت المقدس میں مسجد تعمیر کی تھی۔ ان روایات کی رُو سے یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ مسلمانوں نے یہودیوں کے معبد کو مسمار کر کے اس کی جگہ مسجد تعمیر کی تھی۔ یہ یہودیوں کا سیاسی مقصد تھا۔ اس کے علاوہ ان کا ایک مذہبی مقصد بھی تھا۔ وہ دین کی سطح پر مذہبِ یہودیت کو اسلام سے اعلیٰ اور افضل ثابت نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے اس کے لئے ایک اور حربہ اختیار کیا۔ جب اسے تسلیم کر لیا جائے کہ حضور نبی اکرمؐ اور صحابہ کبارؓ، قریب پندرہ سال تک، کعبہ کو چھوڑ کر، بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے، نماز پڑھتے رہے تھے تو اس سے کعبہ کے مقابلہ میں بیت المقدس کی افضلیت خود بخود ثابت ہو جاتی ہے۔ نیز اس سے بھی کہ حضورؐ معراج کے لئے خانہ کعبہ سے

آسمانوں کی طرف نہیں گئے۔ کعبہ سے بیت المقدس کی طرف گئے۔ وہیں انبیاء کرامؑ نے نماز باجماعت ادا کی۔ اور وہیں سے آپؐ آسمانوں کی طرف تشریف لے گئے۔

ان روایات کے علاوہ، معراج ہی کے ضمن میں ایک اور روایت ہے جس سے حضورؐ پر حضرت موسٰےؑ کی برتری ثابت ہو جاتی ہے۔ وہ روایت یوں ہے کہ جب آپؐ ملاقاتِ خداوندی کے بعد واپس تشریف لاتے ہیں تو راستے میں حضرت موسٰےؑ کے پاس رُکے۔ ان کے استفسار پر فرمایا کہ اللہ تعالٰے نے پچاس نمازوں کا حکم دیا ہے۔ اس پر امام بخاریؒ کے الفاظ ہیں:-

(حضرت موسٰےؑ) نے کہا۔ آپؐ اپنے پروردگار سے پھر کہئیے۔ کیونکہ آپؐ کی اُمّت اتنی طاقت نہیں رکھتی۔ چنانچہ (حضورؐ نے فرمایا کہ) میں لوٹ گیا اور میں نے اپنے پروردگار سے عرض کیا۔ پس اس نے ایک حصّہ معاف کر دیا۔ پھر میں موسٰےؑ کے پاس لوٹا تو انہوں نے کہا اپنے پروردگار سے پھر کہئیے۔ اور انہوں نے ویسا ہی کیا۔ پس اللہ نے ایک حصّہ اور معاف کر دیا۔ پھر میں موسٰےؑ کے پاس لوٹ آیا تو انہوں نے وہی کہا اور پھر میں نے عرض کیا تو اللہ تعالٰے نے ایک اور حصّہ معاف کر دیا۔ پھر میں موسٰےؑ کے پاس لوٹ آیا اور ان سے بیان کیا۔ انہوں نے کہا، آپؐ اپنے پروردگار سے پھر کہئیے کیونکہ آپؐ کی اُمّت اس کی بھی طاقت نہیں رکھتی۔ چنانچہ میں لوٹ گیا اور اپنے پروردگار سے پھر عرض کیا۔ اس نے فرمایا کہ اب یہ (پانچ نمازیں رکھی جاتی) ہیں۔ اور یہ ثواب میں پچاس کے برابر ہیں۔ میرے ہاں بات بدلی نہیں جاتی۔ پھر میں موسٰےؑ کے پاس لوٹ کے آیا۔ انہوں نے کہا کہ اپنے پروردگار سے پھر کہئیے تو میں نے کہا کہ مجھے اب اپنے پروردگار سے شرم آتی ہے۔ (صحیح بخاری۔ کتاب پیدائش انبیاءؑ۔ اُردو ترجمہ۔ شائع کردہ۔ نور محمد۔ تجارتِ کتب۔ کراچی۔ جلد دوم۔ صفحہ ۱۴۶-۱۴۷)

اس روایت پر تفصیلی تبصرہ کا یہ مقام نہیں۔ سرِدست صرف یہ دیکھئے کہ اس کی رو سے، حضرت موسٰیؑ کے مقابلہ میں، حضور نبی اکرمؐ (بلکہ خود خدا کی۔ معاذ اللہ) پوزیشن کیا رہ جاتی ہے؟[1] ان حقائق کی روشنی میں یہ واضح ہے کہ یہودیوں نے ان روایات کو وضع کیا، یہ ثابت کرنے کے لئے کہ خود مسلمانوں کے عقائد کی رُو سے:-

(۱) رسولِ اکرمؐ کے زمانے میں، بیت المقدس میں یہودیوں کا معبد موجود تھا جسے خود خُدا نے (قرآن میں) مسجدِ اقصٰی کہہ کر پکارا ہے۔ اور

(۲) بیت المقدس کعبہ سے افضل ہے اور حضرت موسٰے کا مقام حضور نبی اکرم سے بلند و بالا۔

(٠)

[1] حضرت موسٰےؑ کی رسالت پر ہمارا ایمان ہے۔ لیکن جو کچھ اس روایت میں کہا گیا ہے اس سے بات کہیں سے کہیں جا پہنچتی ہے۔

اس کے بعد دیکھئے کہ حقائق کی روشنی میں صحیح پوزیشن کیا ہے۔ یہودیوں کی سیاسی زندگی میں ان پر متعدد بار حملے ہوئے۔ خود بیت المقدس کئی بار اُجڑا اور کئی بار پھر بسا۔ آخری حملہ ۷۰ء میں رومیوں نے کیا۔ انہوں نے ہیکلِ سلیمانی کی اینٹ سے اینٹ بجادی، اس طرح کہ اس کے بعد اس کے صرف کھنڈرات باقی رہ گئے۔ یہودیوں کو وہاں سے نکال دیا گیا، ایسے کہ وہ پھر وہاں آباد نہیں ہو سکے۔ یہودی اپنی اس تباہی اور ہیکل کے مسمار کئے جانے کی داستان کو رو رو کر بیان کرتے ہیں۔ وہاں ہیکل کی جگہ عیسائیوں نے اپنا گرجا تعمیر کر لیا۔ یہ تھی حالت بیت المقدس اور ہیکلِ سلیمانی کی حضورؐ نبی اکرم کے زمانے میں جسے خود ہمارے مؤرخین نے بھی بصراحت لکھا ہے۔ وہاں "مسجدِ اقصیٰ" نام کی کوئی عمارت ہی نہیں تھی۔

(۲) جب حضرت عمرؓ نے بیت المقدس کو فتح کیا تو دیکھا کہ وہاں چاروں طرف کھنڈرات ہی کھنڈرات ہیں اور ہیکلِ سلیمانی کے مقام پر عیسائی غلاظت پھینکتے ہیں۔ آپ سے ایک قوم (یہود) کی کسی زمانے میں پرستش گاہ کے مقام کی ایسی بے حرمتی دیکھی نہ گئی۔ آپ نے اپنے رفقاء کی مدد سے، اس غلاظت کو خود صاف کیا۔ نماز کا وقت آیا تو آپ عیسائیوں کے معبد "کلیسائے قیامت" میں تھے۔ اسقف نے کہا کہ آپ وہیں نماز پڑھ لیں۔ آپ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اگر میں نے آج یہاں نماز پڑھ لی تو مسلمانوں کے ہاں اس کی طرح پڑھ جائے گی اور اس طرح ہو سکتا ہے کہ وہ تمہارے گرجاؤں کو مسجدیں بنالیں۔ چنانچہ آپ نے ہیکلِ سلیمانی کے کھنڈروں کے قریب، ایک چٹان پر نماز ادا فرمائی۔ اس واقعہ کی یاد میں وہاں ایک سادہ سی مسجد تعمیر کر دی گئی۔

(۳) اموی خلیفہ، عبدالملک بن مروان نے اپنے عہدِ حکومت میں، اس چٹان پر جہاں حضرت عمرؓ نے نماز ادا فرمائی تھی، ایک قبہ تعمیر کرایا جسے قبۃ الصخرہ کہا جاتا ہے۔ اور اس کے قریب ایک عالی شان مسجد بھی تعمیر کرائی۔ چونکہ یہ مسجد، مکہ، مدینہ، بلکہ اموی خلفاء کے دارالسلطنت، دمشق سے بھی بہت دُور تھی، اس لئے یہ مسجدِ اقصیٰ کے نام سے مشہور ہو گئی۔ اقصیٰ کے معنی ہیں بہت دُور۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ مسجدِ اقصیٰ جو اس وقت یروشلم میں موجود ہے، خلیفہ عبدالملک کے عہدِ حکومت میں ۷۲ھ میں وجود میں آئی تھی، یہ نہ زمانہ نبی کریمؐ میں موجود تھی، نہ عہدِ فاروقیؓ میں۔ بنا بریں، سورۂ بنی اسرائیل کی پہلی آیت کی یہ تفسیر بھی مبنی برحقائق نہیں کہ اس میں "مسجدِ اقصیٰ" سے مراد بیت المقدس میں واقعہ ہیکلِ سلیمانی (یہودیوں کی پرستش گاہ) ہے۔ (تفصیل ان امور کی پرویز صاحب کی تصنیف "شاہکارِ رسالتؐ" میں ملے گی)۔

اس کے بعد سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر اس آیت میں، مسجدِ اقصیٰ سے مراد کیا ہے۔ پرویز صاحب نے مفہوم القرآن میں لکھا ہے کہ وہ آیت واقعۂ ہجرت کے متعلق ہے اور اس میں مسجدِ اقصیٰ سے مراد مدینہ منورہ ہے کیونکہ وہ مکہ سے بہت دور واقعہ ہوا تھا۔ پرویز صاحب نے یہ لکھا، اور حسبِ عادت مذہبی پیشوائیت ان کے پیچھے پڑ گئی کہ اس سے احادیث کا انکار ہوتا ہے۔ بلند پایہ

مفسرین کی عظمت کا انکار لازم آتا ہے۔ یہ تعبیر اجماعِ اُمّت کے خلاف ہے۔ سلفِ صالحین کے خلاف ہے ——— اس کا مآل ظاہر ہے ——— یعنی کفر کا فتویٰ۔

لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس کی تائید، جماعتِ اہلِ حدیث کے ایک بلند پایہ عالم، علّامہ عنایت اللہ اثری (وزیر آبادی) کی طرف سے ہوئی (جناب مرحوم ہو چکے ہیں) انہوں نے اپنی کتاب حصول تیسیر البیان (علیٰ) اصول تفسیر القرآن میں، سورۂ اسرائیل کی مذکورہ صدر آیت کی تفسیر کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ اس سے مراد مدینہ کی مسجد ہے۔ انہوں نے تحریر فرمایا کہ

> بخاری (پارہ ۵) میں ہے کہ مسجدِ نبویؐ جس جگہ تعمیر ہوئی اس جگہ پر آپؐ کی تشریف آوری سے پہلے مسلمان اس میں نماز پڑھا کرتے تھے۔ اور فتح الباری (پارہ ۱۵) میں ابنِ سعد سے منقول ہے کہ رسول اللہ کی تشریف آوری سے پہلے مسجدِ نبویؐ کی جگہ پر اسعد نماز پڑھایا کرتے تھے۔ بلکہ جمعہ بھی وہی پڑھایا کرتے تھے۔ پھر جب رسول اللہ تشریف لائے تو آپ بھی وہاں پر ہی نماز پڑھتے اور پڑھاتے رہے۔ پھر اس کے بعد اسعد کی کوششوں سے آپؐ نے وہاں پر مسجد تعمیر فرمائی، جو کہ آج تک مسجدِ نبویؐ کے نام سے موسوم ہے۔ اور جہاں پر مسجدِ قبا تعمیر ہوئی وہاں پر بھی رسول اللہ کی تشریف آوری سے پہلے پنج وقتہ نماز بلکہ جمعہ بھی پڑھا پڑھایا جاتا تھا اور امام سالم تھے اور خطیب مصعب ...... فتح الباری (پارہ ۱۵)۔ میں بحوالہ ابن ابی شیبہ جابرؓ سے مروی ہے کہ مدینہ طیبہ میں رسول اللہؐ کی تشریف آوری سے پہلے جہاں جہاں تبلیغ و اشاعت سے اسلام پھیلا اور لوگ مسلمان ہوگئے وہاں پر مسجد بنا کر نماز شروع کردی۔
>
> (صفحہ ۲۴-۱۲۳ - بحوالہ طلوعِ اسلام - بابت جنوری ۱۹۷۵ء)

اس کے بعد انہوں نے ایک ایسی حقیقت کی پردہ کشائی کی ہے جو اس موضوع پر حرفِ آخر ہے۔ انہوں نے کہا ہے:-

"وفاء الوفا - جلد ۱ - صفحہ ۱۶ میں مطالع وغیرہ کا حوالہ دے کر بیان کیا گیا ہے کہ مدینہ طیبہ کے ناموں میں سے ایک نام اس کا مسجدِ اقصیٰ بھی ہے۔" (ایضاً صفحہ ۱۲۱)

اس سے سارا مسئلہ حل ہو گیا۔ انہی حقائق کی روشنی میں انہوں نے لکھا ہے کہ

> جس مسجد کا ذکر آیۃ اسریٰ (اسرائیل) میں آیا ہے۔ اس سے مراد مدینہ طیبہ ہی ہے۔ بیت المقدس والی مسجد کا نام مسجدِ اقصیٰ ..... بعد میں رکھا گیا تھا۔
>
> (صفحہ ۲۵ - ۱۲۴)

ہمارے "علماء" حضرات میں سے کسی نے نہ علّامہ عنایت اللہ (مرحوم) سے اختلاف کیا، نہ ان پہ اعتراض۔

یہ ہے یہودیوں کے اعتراض کا جواب، اور ان کے استغاثہ کا جوابِ دعویٰ۔ یعنی یہ کہ سنہ ۷۰ عیسوی سے لے کر سنہ ۷۲ھ تک، قریب چھ سو سال کے عرصہ میں، بیت المقدس میں نہ ہیکل سلیمانی موجود تھا۔ نہ ہی یہودیوں کی کوئی پرستش گاہ۔ جسے مسجدِ اقصیٰ کہا جاتا ہے، وہ بنی امیہ کے زمانے میں خالی زمین پر تعمیر کی گئی تھی۔

اس باب میں دورِ جدید کے مفسّر، سید ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) نے جو مؤقف اختیار کیا وہ دلچسپ بھی ہے اور افسوس ناک بھی۔ انہوں نے اپنے ماہنامہ ترجمان القرآن کی اشاعت بابت ستمبر سنہ ۱۹۶۹ء میں تحریر فرمایا:-

> (یہودیوں کے معبد) ہیکلِ سلیمانی کے متعلق یہ بات تاریخ سے ثابت ہے کہ اسے سنہ ۷۰ء میں بالکل مسمار کر دیا گیا تھا اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں جب بیت المقدس فتح ہوا اس وقت یہودیوں کا کوئی معبد نہیں تھا، بلکہ یہاں کھنڈرات پڑے ہوئے تھے۔ اس لئے یہاں مسجدِ اقصیٰ اور قبۃ الصخرٰی کے بارے میں کوئی یہودی یہ الزام نہیں لگا سکتا کہ کسی معبد کو توڑ کر مسلمانوں نے یہ مساجد بنائی تھیں۔ (صفحہ۔ بحوالہ طلوعِ اسلام۔ فروری سنہ ۱۹۷۰ء۔ صفحہ ۴۹-۵۰)

ظاہر ہے کہ اس حق گوئی سے مسلمانوں کا قدامت پرست طبقہ بھی ناخوش ہوا ہوگا اور یہودی بھی چیں بجبیں۔ مودودی صاحب نے اس کی بہت جلد تلافی کر دی۔ اسی ماہ (ستمبر سنہ ۶۹ء) میں، ان کے درسِ قرآن و حدیث میں ایک صاحب نے یہ سوال پوچھا کہ "مسجدِ اقصیٰ کو قبلۂ اوّل کیوں کہا جاتا ہے جبکہ خانۂ کعبہ کی تعمیر اس مسجد سے پہلے عمل میں آئی تھی"؟ اس کے جواب میں مودودی (مرحوم) نے جو کچھ فرمایا وہ غور سے سننے کے قابل ہے۔ انہوں نے کہا:-

> یہ قبلۂ اوّل اس لئے ہے کہ حضورؐ اور آپؐ کے ساتھیؓ اسی طرف رُخ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے۔ جب تحویلِ قبلہ کا حکم آ گیا تو اس کی وہ اہمیت نہ رہی۔ لیکن قبلۂ اوّل ہونے کی حیثیت سے مسلمانوں کے لئے یہ عبادت گاہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مقدّس و محترم قرار پائی ...... جب تک مکہ مکرمہ میں آپؐ کا قیام رہا آپ اس طرح نماز پڑھتے تھے کہ مسجدِ اقصیٰ اور خانۂ کعبہ ایک رُخ میں آ جاتے تھے۔ لیکن مدینہ میں یہ التزام ممکن نہ رہا۔ کیونکہ اب ان عبادت گاہوں کے رُخ مختلف سمتوں میں پڑتے تھے..... (تحویلِ قبلہ سے پہلے) حضورؐ اور آپؐ کے صحابہؓ ایک طویل عرصہ تک مسجدِ اقصیٰ کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے رہے ہیں۔
>
> (ایشیا۔ بابت ۲۱ ستمبر سنہ ۱۹۶۹ء)

یعنی ایک طرف مودودی (مرحوم) نے اپنے رسالہ میں لکھا کہ ظہورِ اسلام کے وقت بیت المقدس میں یہودیوں کی کوئی عبادت گاہ نہیں تھی۔ اور دوسری طرف (اسی ماہ) یہ فرمایا کہ ظہورِ اسلام کے زمانے میں

بیت المقدس میں یہودیوں کا ایک معبد تھا جسے مسجدِ اقصیٰ کہا جاتا تھا اور اس کی طرف رُخ کر کے حضورؐ ایک طویل عرصہ تک نماز پڑھتے پڑھاتے رہے۔

کسی نے ان سے یہ پوچھا۔ (بجز طلوعِ اسلام) کہ حضرت اس کھلے ہوئے تضاد کے کیا معنی ہیں؛ یہ حضرات ان سے پوچھنے کس طرح، جبکہ ہمارا مذہبی لٹریچر بیشتر اسی قسم کے تضادات سے اٹا پڑا ہے۔

ان حقائق کی روشنی میں آپ خود سوچ لیجئے کہ یہودیوں کے اعتراض کا جواب کیا ہے؟ ہمارا قدامت پرست طبقہ خود مانتا ہے کہ ظہورِ اسلام کے وقت بیت المقدس میں یہودیوں کی ایک عبادت گاہ تھی جسے مسجدِ اقصیٰ کہا جاتا تھا۔ اور یہ واقعہ ہے کہ اب وہ عبادت گاہ وہاں موجود نہیں اس کی جگہ مسلمانوں کی ایک مسجد ہے جسے مسجدِ اقصیٰ کہا جاتا ہے۔

نتیجہ ظاہر ہے جب ایک معدوم کو خود آپ موجود بتا رہے ہیں، تو یہودی اس سے فائدہ کیوں نہ اٹھائیں!

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے!

حکومتِ اسرائیل کی قوت کا راز

سوال:- اسی سلسلہ میں ایک اور سوال سامنے آتا ہے۔ چیونٹی کے برابر حکومتِ اسرائیل کے سامنے قریب ایک ارب مسلمانوں کا کوہِ ہمالیہ بےبس نظر آتا ہے۔ سیاسی بست و کشاد اور عسکری تنظیم کو چھوڑ کر، ان کی اس قوت اور ہماری اس بےبسی کا اصولی راز کیا ہے؟

جواب:- یہ اصولی راز، دو غلط فہمیاں ہیں جن میں ہم مبتلا چلے آ رہے ہیں۔ ہمیں صدیوں سے یہ پڑھایا اور سمجھایا گیا کہ یہودی خدا کی مغضوب علیہ قوم ہے۔ اور خدا کا یہ فیصلہ ہے کہ ان کی کبھی حکومت قائم نہیں ہو سکے گی۔ نتیجہ اس کا یہ کہ ہم نے انہیں کبھی سنجیدگی سے (SERIOUSLY) لیا ہی نہیں۔ ہم نے کبھی یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کی کہ حد سے زیادہ عیار اور طرار قوم کر کیا رہی ہے اور اس نے اقوامِ مغرب کی رگِ جاں کو کس طرح اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ ہم نے طلوعِ اسلام میں لکھا کہ یہ سمجھنا کہ انہیں کبھی حکومت نصیب نہیں ہو سکتی، خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کے خلاف ہے۔ اگر کسی موجودہ قوم کے اسلاف سے دو چار ہزار سال پہلے، کچھ جرائم سرزد ہوئے تھے جن کے نتیجہ میں وہ ذلت و مسکنت کے عذاب میں مبتلا ہو گئی تھی، تو اس کے معنی نہیں کہ اس قوم کی آنے والی نسلیں اپنے اسلاف کے جرائم کی وجہ سے ہمیشہ معتوب اور مغضوب رہیں گی۔ اگر وہ قوم ان جرائم سے مجتنب ہو گئی ہے اور اس نے اپنے اندر زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کی صلاحیت پیدا کر لی ہے، تو یہ قانونِ فطرت کے خلاف ہے۔

کہ انہیں ان صلاحیتوں کا پھل نہ ملے۔ ہمارے اس لکھنے پر، مذہبی پیشوائیت کی طرف سے حسبِ عادت، سب و شتم کے تیر برسائے گئے ——— اور یہودی آہستہ آہستہ آگے بڑھتے چلے گئے۔ انہوں نے اپنی سلطنت قائم کرلی۔ اس قدر قوت فراہم کرلی، اور ہمارے واعظ اور خطیب ابھی تک کہتے چلے جا رہے ہیں کہ یہ قیامت تک اپنی حکومت قائم نہیں کرسکیں گے۔ ہمیشہ ذلیل و خوار رہیں گے۔

یہ ہماری پہلی غلط فہمی ہے جس کا ہم خمیازہ بھگت رہے ہیں۔

ہماری دوسری غلط فہمی یہ ہے کہ ہم نے ایک ارب یا لوے کروڑ مسلمان نام رکھنے والے افراد کو ایک قوم فرض کر رکھا ہے۔ یہ ایک قوم نہیں۔ یہ مختلف ممالک میں بسنے والی مختلف اقوام ہیں جن کے مقاصد جداگانہ ہیں۔ مفاد جداگانہ ہیں۔ مصلحتیں جداگانہ ہیں۔ سیاسی مسالک جداگانہ ہیں۔ دیگر اقوام کے ساتھ روابط جداگانہ ہیں۔ خارجی پالیسیاں جداگانہ ہیں۔ ان اقوام کو ایک قوم یا ایک وحدت فرض کرکے ان سے یہ توقع رکھنا کہ اسرائیل (یا کسی اور قوم) کے خلاف ان کا ردِّ عمل ایک ہوگا، اپنے آپ کو خود فریبی میں مبتلا رکھنا ہے۔ یہاں تو ایک مسجد میں، ایک امام کے پیچھے ایک قبلہ کی طرف رُخ کرکے ایک جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے والے چند مسلمانوں کے مفاد و مصالح ایک نہیں ہوتے، چہ جائیکہ ایک ارب مسلمانوں کا نصب العین حیات ایک ہو۔ ہم جس قدر جلد اس خود فریبی سے نکل جائیں، اچھا ہے۔ ان ممالک اور اقوام میں سوائے لفظ مسلمان کے، کچھ بھی قدرِ مشترک نہیں۔ قدرِ مشترک اسلام (دین) ہوسکتا، اور انہیں ملّتِ واحدہ بنا سکتا تھا۔ لیکن اسلام، دنیا میں کہیں ہے ہی نہیں۔ اس کی جگہ مذہب نے لے رکھی ہے اور مذہب، مختلف گروہوں کو ایک قوم بنا نہیں سکتا۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ یورپ کی مختلف قوموں کا مذہب عیسائیت ہے لیکن اس کے باوجود وہ سب ایک قوم نہیں۔ یہی صورت ہماری ہے۔

اسرائیل کے مسئلہ کو اس نقطۂ نگاہ سے سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

(۰)

اسے یاد رکھیئے! (۱) منی آرڈر فارم کے نیچے اور اس کی پشت پر، آپ اپنا نام اور پورا پتہ ضرور لکھیئے اور اس طرح لکھیئے کہ وہ آسانی سے پڑھا جاسکے۔ اس سے ہمیں حساب رکھنے میں آسانی ہوگی اور آپ کے حساب میں کوئی اُلجھن پیدا نہیں ہوگی۔

(۲) کسی ماہ کا پرچہ نہ ملنے پر، سارا غصہ ادارہ طلوعِ اسلام پر نہ نکالا کریں۔ آپ کے اور ادارہ کے درمیان ایک اور کڑی بھی ہے اور وہ ہے ڈاک خانے کا نظام۔ یہاں سے ہر پرچہ چیک کرکے انتہائی احتیاط سے بھیجا جاتا ہے۔ ادارہ اتنا ہی کرسکتا ہے۔ متعلقہ ماہ کی ۱۵ تاریخ تک پرچہ نہ ملے تو ادارہ کی طرف اطلاع دیدیں۔ پرچہ (بشرطِ موجودگی) آپ کو بھیج دیا جائے گا۔ شکریہ

(ناظم ادارہ طلوعِ اسلام)

نقد و نظر

اوائل ۱۹۷۲ء میں ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب کی اوّلین تصنیف (PHENOMENA OF NATURE AND THE QURAN) شائع ہوئی تو پرویز صاحب نے اس پر تبصرہ کا عنوان تجویز فرمایا تھا

قرآنی کوہکن کی جوئے شیر

اس اجمال میں جو تفاصیل مضمر تھیں ان کی تشریح کی ضرورت نہیں۔ اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ "جوئے شیر" سے جہاں کتاب کا حُسن نکھر کر سامنے آجاتا تھا "قرآنی کوہکن" سے صاحبِ کتاب کا نہایت برجستہ تعارف ہو جاتا تھا۔ اس کتاب نے پاکستان اور بیرونِ پاکستان بڑی مقبولیت حاصل کی، اور مصنّف کی تصنیفِ اوّل ہی سے ان کا شمار بین الاقوامی اربابِ فکر میں ہونے لگ گیا۔

اس کے بعد اوائل ۱۹۷۷ء میں ان کی دوسری کتاب CONSPIRACIES AGAINST THE QURAN شائع ہوئی تو اگرچہ وہ سائنس کے حقائق سے متعلق نہیں تھی لیکن اربابِ شریعت اور طریقت کی طرف سے قرآنی فکر پر جو بیز پردے ڈالے گئے تھے، ان کی پردہ فگندگی میں اس نے بڑا کام کیا۔ یہ کتاب متعلقہ حلقہ میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھی گئی۔

پھر ۱۹۷۸ء میں ان کا مختصر سا کتابچہ شائع ہوا جس کا موضوع تھا

(FOOD AND HYGIENE IN ISLAM)

اس میں جسمانی صفائی اور غذائی پاکیزگی جیسے بظاہر پیش پا افتادہ لیکن درحقیقت بڑے بنیادی مسائل کو قرآنی روشنی میں خوبصورت انداز میں بیان کیا گیا تھا۔

اب ان کی چوتھی کتاب اپنی روایتی آب و تاب کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ اس کا موضوع اس کے نام سے ظاہر ہے۔ یعنی (THE HEAVENS, THE EARTH, AND THE QURAN)

اسے ان کی کتاب اوّل کا مطلعِ ثانی سمجھنا چاہیئے۔ آپ غور کیجئے کہ جس کتاب میں ارض و سمٰوٰت کے حقائق کی وضاحت قرآنی روشنی میں کی گئی ہو، وہ کس قدر جامع، وسیع اور عمیق ہو گی! اصل یہ ہے کہ اس تبصرہ میں اس کے مندرجات کی وسعتیں سمٹ نہیں سکتیں۔ اس کے لئے تو ہم اتنا کہہ سکیں گے کہ —— ذوقِ ایں بادہ ندانی بخدا! تا نہ چشی

اس کا اندازہ کتاب کے مطالعہ ہی سے لگ سکے گا۔ اس وقت تک پیرس کے ڈاکٹر (MAURICE BUCAILE) کی کتاب (THE BIBLE, THE QURAN, AND SCIENCE) ہی اس موضوع پر در خورِ مطالعہ سمجھی جاتی تھی۔ لیکن ڈاکٹر عبدالودود صاحب کی تحقیقاتی کاوشوں نے اس سے کہیں زیادہ وسعتوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا ہے۔ معنوی اعتبار کے علاوہ صوری معیار کے لحاظ سے بھی کتاب بڑی جاذبِ نظر اور پُرکشش ہے۔ ضخامت اڑھائی سو صفحات سے زائد۔ مطلّا اور مضبوط جلد۔ قیمت فی جلد ۷۵ روپے

ملنے کا پتہ: (۱) خالد پبلشرز۔ ۳۲ نسبت روڈ۔ لاہور (۲) ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵۔ بی گلبرگ ۲۔ لاہور

قرآنک کالج

(تیسری بار اعلان)

طلوعِ اسلام بابت ستمبر ۱۹۸۲ء میں یہ تاسف انگیز اعلان شائع ہوا تھا کہ ان ناقابلِ عبور موانع کے پیشِ نظر جن کی تفصیل اس اعلان میں دی گئی تھی، قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی نے فیصلہ کیا ہے کہ مجوزہ کالج کے قیام کی سکیم ترک کر دی جائے۔ اس کے ساتھ ہی یہ اعلان بھی کیا گیا تھا کہ جن حضرات نے کالج کی تعمیر کے سلسلہ میں سوسائٹی کو عطیات دیئے تھے۔ وہ اپنے عطیات واپس لے سکتے ہیں۔ اس اعلان کو طلوعِ اسلام بابت اکتوبر ۱۹۸۲ء میں دوبارہ شائع کیا گیا تھا۔ اور اب اسے سہ بارہ شائع کیا جاتا ہے تاکہ اس فیصلہ کی اشاعت زیادہ سے زیادہ وسیع ہو جائے۔

آج کی تاریخ تک معطیان کی طرف سے جو خطوط موصول ہوئے ہیں، ان کے ارشاد کی تعمیل کی جا چکی ہے جن معطیان نے عطیات کی رقوم واپس طلب فرمائی تھیں، انہیں ان رقوم کے کراس چیک بھیجے جا چکے ہیں۔ اگر کسی صاحب کو چیک نہ ملا ہو تو وہ براہِ کرم ہمیں مطلع فرمائیں تاکہ اس کی بابت تحقیق کر لی جائے۔ جو خطوط حالیہ اعلان کے سلسلہ میں موصول ہوں گے ان کی تعمیل بھی حسبِ معمول کی جائے گی۔ معطیان سے ایک گذارش اور بھی ہے۔ اور وہ یہ کہ اگر انہیں حساب فہمی میں کوئی غلطی نظر آئے تو وہ براہِ کرم اس سے مطلع فرمائیں تاکہ اس کی جانچ پڑتال کر لی جائے۔

(۲) عطیات کی واپسی کے لئے جس طریق کار کا پہلے اعلان کیا گیا ہے، اسے پھر دہرا دیا جاتا ہے:۔

(الف) جن احباب نے اپنے عطیات، قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی کو براہِ راست بھیجے تھے، وہ اپنے مطالبہ کا خط (سیکرٹری قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی - 25/B - گلبرگ ۲ لاہور) کے نام براہِ راست بھیج دیں۔ اس میں عطیہ کی رقم کے علاوہ اس رسید کا نمبر اور تاریخ بھی درج ہونی چاہیئے جو اس عطیہ کے موصول ہونے پر جاری کی گئی تھی۔ اگر وہ رسید موجود نہ ہو، تو طلوعِ اسلام کے جس شمارہ میں وہ فہرست شائع ہوئی تھی جس میں وہ عطیہ درج تھا، اس کا حوالہ دے دیا جائے۔ مطالبہ خود معطیان کی طرف سے آنا چاہیئے۔ یہ ضروری ہے۔

ب:۔ اگر کسی صاحب نے اپنا عطیہ طلوعِ اسلام کی کسی بزم کی معرفت بھیجا ہو، تو وہ اپنا مطالبہ متعلقہ بزم کی وساطت سے بھیجیں اور وہ بزم ضروری حوالے کے بعد، مطالبہ سوسائٹی کو بھیج دے۔

ج:۔ عطیہ کی رقم (احتیاطاً) کراس چیک کے ذریعہ بھیجی جائے گی کہ یہی طریقہ زیادہ محفوظ ہوتا ہے۔

د:۔ بیرونی ممالک سے معطیان نے جو عطیات بھیجے تھے وہ ہمیں یہاں پاکستانی کرنسی میں موصول ہوئے

تھے۔ ہم ان رقوم کو پاکستانی کرنسی ہی میں ادا کر سکتے ہیں۔ بیرونِ ممالک رہنے والے حضرات اس سے بھی مطلع فرمائیں کہ انہیں کس طرح یہ رقوم ادا کی جائیں۔

جن معطیان کو، مطالبے کے بعد، دو ہفتہ کے اندر، چیک یا جواب نہ ملے، وہ براہِ کرم یاددہانی کا کارڈ ارسال فرمادیں، کیونکہ ہو سکتا ہے کہ ان کے مطالبہ کا خط ہم تک نہ پہنچ پایا ہو۔

(۳) اکثر احباب نے دریافت کیا ہے کہ اب میرا پروگرام کیا ہے۔ ان کی اطلاع کے لئے تحریر ہے کہ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت میری زندگی کا مشن ہے۔ جسے میں ۱۹۳۸ء سے، ادارۂ طلوعِ اسلام کی وساطت سے سرانجام دیئے چلا آرہا ہوں۔ یہ میرا مستقل پروگرام ہے جو بدستور جاری رہے گا۔ جہاں تک قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی کا تعلق ہے، احباب کی طرف سے مجھے بہت سی تجاویز موصول ہوئی ہیں جیسا کہ میں نے طلوعِ اسلام بابت اکتوبر ۸۲ء میں لکھا تھا، وہ تجاویز میرے زیرِ غور ہیں اور میں حالات کا بنظرِ غائر مطالعہ کر رہا ہوں۔ جب تک میں کلیتہً مطمئن نہ ہو جاؤں، میں کوئی نیا فیصلہ نہیں کرنا چاہتا۔ احباب کے دل میں تو صرف ایک خواہش یا آرزو بیدار ہوئی ہے، اور میرے سامنے ان آرزوؤں کی برومندی اور تکمیل کا سوال ہوتا ہے۔ اس لئے مجھے فیصلہ سوچ سمجھ کر کرنا ہوتا ہے۔

ہماری (یعنی انسانی) زندگی کا المیہ یہ ہے کہ عمر کا بیشتر حصہ تجربوں میں گذر جاتا ہے، اور جب، عمر کے آخری حصہ میں ان سے استفادہ کا وقت آتا ہے تو اس زندگی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اگلی زندگی میں تو ان سے فائدہ اٹھانے کا شاید موقعہ ہی نہیں ہوگا کیونکہ وہاں کے احوال و کوائف یہاں سے مختلف ہوں گے

میرے حال پر البتہ مبداء فیض کی قابلِ صد شکر کرم گستری رہی ہے۔ ناکام تجربات کا میں بھی تختۂ مشق بنتا رہا ہوں لیکن قرآن کے ساتھ عشق نے مجھے اپنے اندر اس قدر جذب کئے رکھا کہ ان ناکامیوں سے میں چنداں متاثر نہیں ہوا۔ جب بھی کوئی نیا حادثہ پیش آیا سروشِ عشق نے کان میں کہہ دیا کہ جتنا وقت اور توانائی تم اس کی مدافعت میں صرف کروگے، اتنا ہی ہرج تمہارے مشن کا ہو جائے گا۔ اس لئے میں نے نقصان اٹھا لیا، لیکن اپنے مشن کو متاثر نہ ہونے دیا۔ احباب اکثر پوچھا کرتے ہیں کہ تم نے اس قدر کام کس طرح کر لیا؟ اس کا ایک راز یہ بھی ہے کہ ؎

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا! جو غم ملا اسے غمِ جاناں بنا دیا

(۴) یہ اعلان تین بار شائع ہو گیا ہے۔ اس کے مزید اعادہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ آخر میں میں ایک بار پھر احباب کی اس مخلصانہ اعانت کے لئے شکر گذار ہوں جو انہوں نے قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی کے سلسلہ میں کی۔ اللہ انہیں خوش و خرم رکھے اور زندگی کے سربلند مقصد میں کامیاب و کامران فرمائے۔ والسلام

(چیئرمین قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی) 24.X.82

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن

جتنے مقامی بزم ہائے طلوع اسلام کے اہتمام سے ہفتہ وار یا ماہانہ کیسٹ یا ٹیپ ریکارڈرز کے ذریعے حسب ذیل مقامات اور اوقات پر باقاعدگی کے ساتھ نشر کیا جاتا ہے :-

نام بزم طلوع اسلام	دن اور وقت	مقام درس کے کوائف :-
		نوٹ :- پرویز صاحب کے درس کے دوران ہی متعدد کیسٹیں اور ٹیپیں بزموں کے لئے ریکارڈ کر لئے جاتے ہیں۔
لاہور	جمعہ ۹ بجے صبح	۲۵/بی گلبرگ ۲ (نزد پولیس سٹیشن) فون نمبر ۸۸۰۸۰۰
لندن (انگلینڈ)	ہر ماہ کا پہلا اتوار ۲ بجے دوپہر	76, PARK ROAD, ILFORD. TEL: 553-1896
برمنگھم (انگلینڈ)	ہر ماہ کا پہلا اتوار دو بجے دوپہر	(بمقام) 60. HERICK RD, SALTLEY, B8 INT.
اوسلو (ناروے)	ہر ماہ کا پہلا و تیسرا پیر شام ۶ بجے	(بمقام) MR MANZOOR AHMAD, DOVREGATE-7/OSLO 1
ٹورنٹو (کینیڈا)	ہر ماہ کا پہلا اتوار ۱۰ بجے صبح	335 DRIFTWOOD AVE #311, DOWNS VIEW, TORONTO (NORTH YORK) (ONT): M3N-2P3. PHONE (416) 661-2827
کراچی ۲	ہر جمعہ ۹ بجے صبح	کتب خانہ بزم طلوع اسلام کمرہ ۲۲ ہارون چیمبرز۔ الطاف حسین روڈ نیو چالی۔ فون: ۲۲۸۸۲۸
پشاور	۱۔ ہر جمعہ ۵ بجے شام	رہائش گاہ آغا محمد یونس صاحب۔ رفیقی لین صدر (OPP: VIP MAINGATE) پشاور سٹیڈیم بارہ روڈ فون ۷۲۴۵۹
	۲۔ ہر جمعہ ۹ بجے صبح	ہوٹل نعمت کدہ۔ یونیورسٹی روڈ۔ جہانگیر آباد۔
مردان	ہر جمعہ ۱۰ بجے صبح	عبداللطیف۔ محمود علی صاحب۔ اسماعیل بلڈنگ نواب علی روڈ
راولپنڈی	ہر جمعہ ۵ بجے شام	جی-۶۶، لیاقت روڈ
لیہ	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	شبیر مکینیکل انجینئرنگ ورکس۔ تھہیم روڈ (لیہ)
ایبٹ آباد	ہر جمعہ ۴ بجے شام	رہائش گاہ صلاح الدین صاحب۔ واقع 23A-K-L کیمپال (ایبٹ آباد)
سرگودہا	ہر جمعہ ۳ بجے سہ پہر	چوک واٹر سپلائی ٹی ۶ مکان نمبر ۴۔ نظامی منزل
بہاولپور	ہر جمعہ ۸ بجے صبح	عثمانی خیراتی شفاخانہ، غنی پورہ باہتمام (ڈاکٹر ہومیو) محمد اعظم خان صاحب۔
چکوال	ہر جمعہ ½ ۹ بجے صبح	ضیا ٹیوشن سنٹر، نزد ہجویری مسجد باہتمام ماسٹر غلام حسین صاحب نمائندہ بزم طلوع اسلام۔
کوئٹہ	باقاعدہ ہفتہ وار	رابطہ کے لئے ریڈیو اینڈ الیکٹرک سنٹر، ترخی روڈ۔ باہتمام غلام صابر صاحب
گوجرانوالہ	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	دفتر بزم، ملحق رہائش گاہ چوہدری مقبول شوکت۔ گل روڈ۔ سول لائنز۔
گجرات	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ و ہر اتوار ۴ بجے سہ پہر	بمقام ۱۲۰/ل مسجد روڈ۔۔۔۔ باہتمام شیخ قدرت اللہ صاحب ایڈووکیٹ
جلالپور جٹاں	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	دفتر بزم طلوع اسلام (بازار کلاں)
ملتان	ہر جمعہ ۱۰ بجے صبح	دفتر شاہ سنز۔ بیرون پاک گیٹ (فون: ۳۱۰۷۱)
بچکسی تحصیل کبیر والا (ملتان)	ہر جمعہ ۳ بجے سہ پہر	بمقام مطب حکیم احمد الدین صاحب (نمائندہ بزم)
ہنگو	ہر جمعہ ½ ۵ بجے شام	رہائش گاہ محمد جمیل صاحب واقع ریلوے روڈ (فون ۶۷)
فیصل آباد	ہر جمعہ ½ ۴ بجے بعد دوپہر	بمقام حیات سرجری کلینک ۲۳/پ پیپلز کالونی ۱ (فون: ۲۸۵۵۰)

اسلام ـــــ دورِ ملوکیت میں

(قسط اوّل ـــــ غلام اور لونڈیاں)

صدرِ اول کے اسلام کے متعلق ہمارے ہاں بڑی کثرت سے لٹریچر ملتا ہے جس میں اگرچہ صحیح کے ساتھ غلط بھی ملوث ہوتا ہے لیکن بایں ہمہ اگر اس کا بنگاہِ تحقیق مطالعہ کیا جائے تو اس سے اس عہدِ سعادت مہد کی ایسی جھلکیاں سامنے آجاتی ہیں جن سے نگاہوں میں بصیرت اور قلب میں طمانیت پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن (اس کے بعد) ہمارے دورِ ملوکیت میں کس قسم کا اسلام وضع ہو گیا تھا اس کے متعلق بہت کم معلومات سامنے آتی ہیں اور عام طور پر سمجھا یہ جاتا ہے کہ وہ دور (بالخصوص دورِ عباسی) ہمارے تمدن و تہذیب اور علم و ثقافت کے عروج کا زمانہ تھا۔ ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ اس دور کی کچھ جھلکیاں قارئین کے سامنے لائیں جن سے یہ منتشح ہو جائے کہ جب دین، مذہب میں اور خلافت، ملوکیت میں تبدیل ہو گئی تو اس سے کس قسم کا معاشرہ وجود میں آیا تھا۔ مصر کے نامور مؤرخ، علامہ احمد امین نے اسی دور کی تاریخی تفصیلات اپنی شہرۂ آفاق تصنیف ضحی الاسلام میں بڑے ادیبانہ پیرایہ میں پیش کی ہیں۔ ہم اس میں سے اس باب کا ترجمہ پیش کرتے ہیں جو غلام اور لونڈیوں سے متعلق ہے۔

واضح رہے کہ نزولِ قرآن کے وقت (دنیا کے دیگر معاشروں کی طرح) عرب معاشرہ میں بھی غلاموں اور لونڈیوں کی بھرمار تھی اس کا اوّلین سرچشمہ جنگ میں گرفتار ہونے والے قیدی تھے۔ ان کے مردوں کو غلام اور عورتوں کو لونڈیاں بنایا جاتا تھا۔ قرآن کریم نے یہ حکم دے کر جنگ کے قیدیوں کو رہا کرنا ہوگا، خواہ فدیہ لے کر اور خواہ احساناً (۴۷/۴) غلامی کے اس دروازے کو ہمیشہ کے لئے بند کر دیا۔ اور جو غلام اور لونڈیاں اس وقت عربی معاشرہ میں موجود تھے، انہیں رفتہ رفتہ آزاد کرنے، اور جب تک وہ آزاد نہ کئے جا سکیں ان سے حسنِ سلوک کے لئے بکثرت احکام نازل کئے۔ یہ جو آپ قرآن کریم میں "ملکت ایمان" کے متعلق آیات دیکھتے ہیں وہ انہی غلاموں اور لونڈیوں سے متعلق ہیں۔ اس میں کسی کو غلام بنانے کی اجازت قطعاً نہیں۔

لیکن ہمارے دورِ ملوکیت میں اس بند کو وہ پھاٹک کو اس زور سے کھولا گیا کہ سارا معاشرہ غلاموں (بالخصوص) لونڈیوں سے بھر گیا۔ بادشاہوں اور امراء نے انہیں اپنے حرم میں داخل کیا اور فقہا نے ان کے متعلق احکامِ شریعت وضع کئے جو آج تک مروج چلے آرہے ہیں۔

آیئے دیکھئے کہ علامہ احمد امین نے اس دور کا نقشہ کن الفاظ میں کھینچا ہے۔ ہم نے عربی اشعار حذف کر کے ان کے ترجمہ پر اکتفا کیا ہے۔

اسلام میں غلامی کا قانونی مؤقف

اس سے پہلے کہ غلاموں اور ان کے اثرات سے گفتگو کریں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم اسلامی مملکت میں غلامی کے قانونی مؤقف کی مختصر سی وضاحت کر دیں یعنی بالفاظِ دیگر یہ بتا دیں کہ اس پر کیا اسلامی احکام منطبق ہوتے تھے۔

اسلامی تعلیمات[1] کا یہ فیصلہ ہے ——— یا کم از کم ——— ان مبادی کا یہ فیصلہ ہے جن سے ائمہ نے اصول احکام مستنبط کئے ہیں[2] اور اسی پر آج تک ——— یعنی اس عہد تک جس کی ہم تاریخ لکھ رہے ہیں ——— اسی پر عمل ہوتا تھا کہ غلامی کا سبب کسی کافر کا جنگ میں گرفتار ہو کر مسلمانوں کے قبضہ میں آجانا ہے۔ چنانچہ مسلمان جب کفار سے جنگ کریں تو محاربین میں سے جو لوگ گرفتار ہو جائیں امام کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ اگر وہ چاہے تو ان کو غلام بنا لے جیسا کہ اس کے لئے یہ بھی جائز ہے کہ وہ اس شہر کے تمام باشندوں کو جسے اس نے جنگ کر کے فتح کر لیا ہے غلام بنا لے۔ مردوں کو بھی اور عورتوں کو بھی[3] کفر اور قید ہو جانا، یہی دونوں باتیں غلامی کا سبب ہوتے ہیں۔ غلامی باقی رہنے کے لئے اس کے سبب کا باقی رہنا ضروری نہیں ہے۔ اگر کوئی کافر گرفتار ہو کر غلام بنا لیا جائے اور اس کے بعد وہ مسلمان ہو جائے تو غلامی اس سے دور نہیں ہوگی۔ یہ غلام مال شمار ہوتے ہیں۔ ان کا حال بعینہٖ وہی ہے جو دوسرے سامان کا ہوتا ہے جنگ میں جو لوگ غلام بنا لئے جائیں وہ مالِ غنیمت کا اسی طرح ایک حصہ شمار ہوتے ہیں جیسے آلاتِ جنگ، نقود اور گھوڑے وغیرہ۔ بہرحال ان کی مثال بعینہٖ ان قابلِ قیمت چیزوں کی طرح ہوتی ہے جو فاتحین کے قبضہ میں آجائیں۔ ان چیزوں کا حال یہی ہوتا ہے کہ امام ان کو دارالاسلام کی طرف منتقل کر لیتا ہے۔ پھر ان کا پانچواں حصہ امام لے لیتا ہے تاکہ اسے عام مصالح میں خرچ کر سکے یعنی فقراء اور مساکین کو دیدے اور دوسرے نیکی کے مختلف مصارف میں خرچ کر دے وہ گئے باقی چار خمس تو وہ ان لوگوں پر تقسیم کر دیئے جاتے ہیں۔ جو جنگ میں شریک رہے ہوں۔ غلاموں کے ساتھ بھی یہی کچھ کیا جاتا ہے۔ ان کا پانچواں حصہ مصالح عامہ کے لئے ہوتا ہے اور باقی جنگ کرنے والوں میں تقسیم کر دیئے جاتے ہیں۔ جنگ کرنے والوں پر تقسیم کرتے ہوئے سوار اور پیادہ کے درمیان امتیاز رکھا جاتا ہے یعنی بعض فقہاء کے قول میں سوار کو دو حصے ملتے ہیں اور پیادہ کو صرف ایک حصہ ملتا ہے۔ اس طریقہ سے جو ہم نے بیان کیا ہے غلاموں کو تقسیم کیا جاتا تھا۔

ابتداءِ اسلام میں جنگیں چونکہ مسلسل ہوتی ہی رہتی تھیں جن میں فتح عموماً مسلمانوں کی ہوتی تھی اور یہ سلسلہ برابر جاری رہتا تھا مفتوحہ ممالک اور مغلوب اقوام کا کوئی شمار نہیں تھا۔ اس سے ہم اس بات کا تصور کر سکتے ہیں کہ غلاموں کی تعداد کتنی بے شمار ہوتی ہوگی۔ اور وہ کس قدر مختلف اور متنوع ہوتے ہوں گے۔ کیونکہ جن قوموں سے مسلمان برسرِ جنگ

---

[1] اسلامی تعلیمات یا اسلامی مبادی کا نام لینا غلط ہے۔ قرآن نے غلامی کے رواج کو قطعاً بند کر دیا ہے اور اس کی اسلامی معاشرہ میں کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑی ہے۔ ملاحظہ ہوں سورہ محمد کی متعلقہ آیات۔ (طلوعِ اسلام)

[2] اس سلسلہ میں فجر الاسلام کے جزو اول میں جو کچھ ہم نے لکھا ہے اسے ملاحظہ فرما لیجئے۔ (احمد امین)
مسلمان سلاطین۔ امراء اور دیگر ارباب ثروت نے جو غلام اور لونڈیاں رکھیں ان کا یہ عمل قرآن کریم کے صریحاً خلاف تھا۔ (طلوعِ اسلام)

رہتے تھے وہ خود مختلف انواع و اجناس سے تعلق رکھتی تھیں۔ جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ یہ غلام کسطرح تقسیم کئے جاتے تھے اس سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ وہ کس طرح جنگ کرنے والے مسلمانوں میں پھیل گئے ہوں گے اور ان کے ایک ایک گھر میں داخل ہو گئے ہوں گے۔ پھر چونکہ ان غلاموں کو قطعاً مال کی طرح سمجھا جاتا تھا اور ان پر خرید و فروخت، اجارہ اور رہن کے تمام مالی معاملات جاری ہوتے تھے اس لئے ہم آسانی کے ساتھ یہ بھی سمجھ سکتے ہیں کہ یہ غلام صرف جنگ کرنے والے سپاہیوں تک ہی محدود نہیں رہتے تھے بلکہ تمام لوگوں کو ان پر دسترس حاصل تھی۔ ان کے بازار ہوا کرتے تھے جہاں سے جو چاہتا ان کو خرید لیتا اور جس طرح چاہتا ان سے خدمت لیتا[1]

یہ گفتگو محض مالی جہت سے تھی۔ رہ گیا جنسی جہت سے مردوں کا تعلق باندیوں کے ساتھ۔ تو اسے ہم مختصراً اب بیان کرتے ہیں۔

مسلمانوں میں دو ذریعے ہیں جو ایک عورت کو مرد کے لئے حلال کر دیتے ہیں۔ ان میں سے ایک ذریعہ تو عقد نکاح کا ہے اور دوسرے ملک یمین کا۔ جہاں تک عقد نکاح کا تعلق ہے تو ایک آزاد آدمی کے لئے چار عورتوں سے زیادہ سے شادی کرنا جائز نہیں ہے۔ یعنی اس کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ ایک وقت میں اس کے نکاح کے اندر چار بیویوں سے زیادہ ہوں۔ لیکن اس کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ ان چار میں سے کچھ کو طلاق دے دے اور ان کی عدت گزر جانے کے بعد ان کے علاوہ دوسری عورتوں سے شادی کر لے۔ اکثر فقہا کا یہی مسلک ہے۔ کچھ فقہاء کے دوسرے اقوال بھی ہیں جن کو بیان کرنے کا یہ موقع نہیں ہے ——— یہ حکم عام ہے۔ یہ چاروں بیویاں آزاد بھی ہو سکتی ہیں اور باندیاں بھی ——— اس موضوع میں فقہاء نے زیادہ سے زیادہ اتنا ہی کہا ہے کہ کسی آدمی کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کسی باندی سے نیا عقد نکاح کرے جب کہ اس سے پہلے اس کے گھر میں ایک آزاد عورت اس کی بیوی کی حیثیت سے موجود ہو۔ البتہ اس کے برعکس کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے یعنی ایک منکوحہ باندی کے ہوتے ہوئے وہ ایک آزاد عورت سے نکاح کر سکتا ہے۔ اس میں فقہاء نے اس امر کا لحاظ رکھا ہے کہ ایک آزاد بیوی سے شادی کر لینے کے بعد باندی سے نکاح کر لینے میں اس آزاد بیوی کی توہین اور اس کے شرف اور عزت پر حملہ سمجھا جائے گا۔

دوسرا ذریعہ جو ایک عورت کو ایک مرد کے لئے حلال کر دیتا ہے "ملک یمین" ہے یعنی کسی مرد کے لئے باندی کا مالک ہو جانا۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ (اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ چند بیویوں میں عدل نہیں کر سکو گے تو پھر ایک ہی شادی کرو یا ملک یمین پر اکتفا کرو) اور وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ

---

[1] جہاں تک اس عہد کا تعلق ہے جس کی تاریخ بیان کی جا رہی ہے۔ مصنف نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ تاریخی حیثیت سے صحیح ہو تو ہو، مگر تاریخ کے اس المیہ کو قرآن اور اسلامی تعلیمات سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ قرآن کریم نے غلامی کی رسم کو قطعاً بند کر دیا تھا۔ تفصیلات کے لئے دیکھئے ادارہ طلوع اسلام کی طرف سے شائع شدہ کتاب "غلام اور لونڈیاں" (طلوع اسلام)

(اور وہ لوگ جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں بجز اپنی بیویوں کے یا ملک یمین کے کہ ان پر کوئی ملامت نہیں ہے۔) چنانچہ جس کی ملکیت میں کوئی باندی آجاتی اس کے لئے جائز ہوتا کہ وہ اس سے استمتاع کرے وہ اس کے لئے حلال ہوتی تھی خواہ اس سے شادی کرلے یا شادی نہ کرے۔ خواہ اس کے ایک بیوی پہلے سے موجود ہو یا چار بیویاں پہلے سے موجود ہوں۔ مرد پر اس سلسلہ میں کسی تعداد کی کوئی پابندی نہیں تھی۔ چنانچہ اس کے لئے جائز تھا کہ وہ چار تک شادیاں کرلے اور جتنی چاہے باندیاں اپنی ملکیت میں رکھے اور جتنی باندیوں سے چاہے استمتاع کرتا رہے۔ خواہ وہ کتنی ہی کثیر التعداد کیوں نہ ہوں[۲]

اس وجہ سے ایک اسلامی گھرانے میں[۳] ——— عموماً ——— ایک یا کئی بیویاں ہوتی تھیں اور ان کے ساتھ ساتھ متعدد باندیاں ہوتی تھیں جن سے گھر کا مالک استمتاع کرتا رہتا تھا۔

آزاد بیویوں اور ان متنوع باندیوں کے درمیان اکثر جھگڑے بھی ہوتے تھے۔ اور ایسا ہونا طبیعی تھا ——— حتیٰ کہ بعض اہل لغت نے یہ بھی کہا ہے کہ ان باندیوں کو سراری اسی لئے کہا جاتا تھا کہ باندیاں رکھنا عموماً بیویوں میں غیرت کے جذبات کو بھڑکانے کا موجب ہوتا تھا۔ لسان العرب کے مصنف نے بعض علمائے لغت سے نقل کیا ہے کہ سُرِّیَّۃ اس باندی کو کہتے تھے جس سے اس کا مالک استمتاع کرنا چاہتا تھا ——— خلاف قیاس طریقہ پر یہ سِرٌّ کی طرف نسبت ہوتی تھی جس کے معنی اخفاء کے ہوتے ہیں۔ لوگ عموماً اس بات کو کہ وہ اپنی باندی سے استمتاع کر رہے ہیں اپنی آزاد بیویوں سے چھپاتے تھے۔ عموماً جب ایک آدمی کی نسل آزاد عورتوں اور باندیوں دونوں سے چلتی تھی تو آزاد بیویوں کی اولاد، باندیوں کی اولاد پر فخر کرتی تھی اور وہ اس بات پر عزت محسوس کرتی تھی کہ اس کی رگوں میں غلامی کا خون نہیں ہے۔ مثال کے طور پر اس اختلاف کو دیکھئے جو محمد امین اور مامون الرشید کے درمیان تھا۔ دونوں کے دونوں ہارون الرشید کے بیٹے تھے لیکن امین کی ماں آزاد بیوی تھی اور مامون کی متنوعہ باندی تھی۔ ہم اس قسم کی کئی مثالیں پہلے بھی بیان کر چکے ہیں جن کا تعلق خلفاء کے گھرانوں اور ان کی متنوع اولاد سے تھا۔ رعایا کے گھروں کا حال بھی کچھ اس سے مختلف نہیں تھا۔ اس ضمن میں ان کے گھر بھی خلفاء کے گھرانوں کا نمونہ ہی تھے۔

یہ غلام جن کا حال ہم نے بیان کیا ہے، مرد ہوں یا عورتیں، انہیں اس وقت تک ان کی آزادی واپس نہیں ملتی تھی جب تک ان کا مالک انہیں آزاد نہ کر دے۔ فقہاء نے غلاموں کو آزاد کرنے کے لئے اپنی کتابوں میں لمبے لمبے باب بیان کئے ہیں۔ جن میں انہوں نے ان الفاظ کا حکم بتایا ہے جن سے آزادی واقع ہو جاتی تھی اور جو مختلف صورتیں اس ضمن میں پیش آتی تھیں۔ یہاں ہمیں ام الولد کے متعلق کچھ بیان کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ام الولد اس باندی کو کہتے تھے جس کے شکم سے اس کے مالک کا کوئی بچہ پیدا ہو جاتا تھا۔ فقہاء نے ایسی باندی کا رتبہ اس باندی سے بلند رکھا ہے۔

---

[۱] یہ حکم آئندہ کے لئے نہیں تھا بلکہ ان باندیوں کے متعلق تھا جو معاشرہ میں پہلے سے چلی آتی تھیں یہی وجہ ہے کہ مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ میں مَلَكَتْ بصیغۂ ماضی استعمال ہوا ہے، قرآن نے غلامی کے دروازہ کو آئندہ کے لئے بند کر دیا تھا جس کی تصریح سورۂ محمدؐ میں ہے۔ [۲] ملاحظہ ہو بدائع صفحہ ۶۶ ۲ جلد ۳

[۳] مسلمانوں کے گھرانے میں" کہئے۔ اسلامی گھرانے میں نہیں (طلوع اسلام)

جس سے کوئی بچہ پیدا نہ ہوا ہو۔ اسے بعض وہ حقوق حاصل ہوتے تھے جو دوسری باندیوں کو حاصل نہیں ہوتے تھے۔ ان میں سے اہم ترین حق یہ تھا کہ اس کا مالک جب کہ وہ اس سے بچے پیدا کر رہا ہو، اسے فروخت یا ہبہ نہیں کر سکتا تھا —— جمہور فقہاء کا مذہب یہی ہے —— لیکن جب تک مالک زندہ ... رہتا وہ اپنے مالک کے لئے حلال رہتی تھی اگر مالک مر جاتا تھا تو وہ آزاد ہو جاتی تھی اور اس پر آزاد عورتوں کے تمام احکام جاری ہوتے تھے۔ جو اولاد اس کے بطن سے پیدا ہوتی تھی وہ بہرحال آزاد ہی ہوتی تھی۔

غلامی کے مسئلہ کی قانونی پوزیشن اس نظام میں جو اس زمانہ میں رائج تھا جس کی تاریخ ہم لکھ رہے ہیں یہی کچھ تھی۔ بہرحال اتنی بات کو جان لینا ان ادبی، علمی اور اجتماعی نتائج کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے جو اس سے پیدا ہوئے۔

مسلمانوں، نصرانیوں اور یہودیوں سب ہی کے ہاں یکساں طور پر غلامی کا رواج تھا۔ لیکن یہود و نصاریٰ کے ہاں ان سے استمتاع کرنے کی شرعاً اجازت نہیں تھی اگرچہ قانون کے خلاف ان میں بھی کچھ لوگ اس کا ارتکاب کرتے تھے۔ لوگوں کا بیان ہے کہ ابوجعفر منصور نے اپنے طبیب جورجیس ابن بختیشوع نصرانی کو تین حسین و جمیل رومی باندیاں تین ہزار دینار کے ساتھ تحفہ میں بھیجیں تو جورجیس نے باندیاں واپس کر دیں۔ منصور نے اس سے پوچھا کہ باندیاں کیوں واپس کر دیں؟ اس نے جواب دیا کہ ہم نصرانی لوگ ایک بیوی سے زیادہ شادی نہیں کرتے جب تک بیوی زندہ رہے اور اس کے علاوہ کوئی عورت نہیں رکھ سکتے۔[1]

لیکن دوسری طرف جاحظ نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ "طیماثو" جاثلیق کے رئیس نے ارادہ کیا کہ عون عبادی کے اس فعل کو ناجائز قرار دیدے (عون عبادی نصرانی تھا) جب کہ اسے یہ اطلاع ملی کہ عون عبادی نے استمتاع کیلئے باندیاں رکھ چھوڑی ہیں۔ تو عون عبادی نے جاثلیق کو دھمکی دی تھی اور قسم کھائی تھی کہ اگر اس نے ایسا کیا تو وہ مسلمان ہو جائے گا۔[2]

قفطی نے بیان کیا ہے کہ نصاریٰ نے یوحنا بن ماسویہ کے اس فعل پر ناگواری ظاہر کی کہ اس نے باندیاں رکھ چھوڑی تھیں۔ چنانچہ انہوں نے اس سے کہا کہ تم نے ہمارے دین کی خلاف ورزی کی ہے حالانکہ تم ہمارے مذہبی پیشوا ہو۔ یا تو ہمارے طریقہ پر قائم رہو اور ایک بیوی پر اکتفا کرو، اس طرح تم ہمارے مذہبی پیشوا رہ سکتے ہو۔ ورنہ مذہبی پیشوائیت سے الگ ہو جاؤ اور جتنی چاہیے باندیاں رکھ چھوڑو۔ یوحنا نے کہا کہ ہمیں انجیل مقدس میں ایک مقام پر یہ حکم دیا گیا ہے کہ ہم نہ تو عورتیں رکھیں اور نہ دو کپڑے رکھیں۔ وہ کون سا قانون ہے جو جاثلیق کو تو حق دے دیتا ہے کہ وہ ایک کے بجائے بیس کپڑے رکھے اور یوحنا شقی کو یہ حق نہیں دیتا کہ وہ چار باندیاں رکھ سکے۔ اپنے جاثلیق سے جا کر کہو کہ وہ اپنے دین کے قوانین کی سختی کے ساتھ پابندی کرے تاکہ ہم بھی اس کے ساتھ دین کے قوانین کا لحاظ رکھ سکیں۔ اگر وہ دین کی خلاف ورزی کرتا ہے تو ہم بھی دین کی خلاف ورزی کریں گے۔[3]

بیزنطینی مملکت میں غیر نصرانی رعایا کے لئے اس کی اجازت نہیں تھی کہ وہ نصرانی غلام رکھ سکیں لیکن مسلمانوں نے

---

[1] اخبار الحکماء صفحہ ۱۵۵ [2] الحیوان للجاحظ صفحہ ۹ جلد ۴

[3] اخبار الحکماء صفحہ ۳۸۷

یہود و نصاریٰ کو اس کی اجازت دے رکھی تھی کہ وہ غلام رکھ سکتے ہیں خواہ وہ غلام مسلمان ہی کیوں نہ ہوں۔

غلاموں کی تجارت

اس عہد میں پوری مملکت اسلامیہ میں غلاموں کی تجارت خوب پھیلی ہوئی تھی۔ بغداد میں ایک سڑک کا نام ہی "شارع دار الرقیق" (غلاموں کے بازار کی سڑک) پڑ گیا تھا[1]۔ امین اور مامون کے درمیان جنگ ہوئی تو یہ بازار لوٹ لیا گیا تھا۔ کسی شاعر نے ایک لمبے قصیدہ میں اس کا مرثیہ کہا ہے جس کے آخری شعر کا ترجمہ یہ ہے۔

میں کتنی ہی باتیں جو اس سلسلہ میں ہوئی ہیں بھول جاؤں لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں غلاموں کے بازار کو ہمیشہ یاد رکھوں گا۔

غلاموں کی تجارت کرنے والے کو نَخَّاس کہا جاتا تھا ——— یہ لفظ دراصل چوپایوں کی تجارت کرنے والوں کے لئے تھا۔ اس عہد میں بغداد کے اندر بہت سے نخاس مشہور تھے۔ ان کی شہرت کا سبب یہ تھا کہ ان کے پاس نہایت حسین و جمیل باندیاں ہوتی تھیں جن کے پاس اکثر شعراء اور امراء آتے جاتے تھے۔ چنانچہ محلّہ کرخ میں ایک نخاس تھا جس کی کنیت "ابو عمیر" تھی۔ اس کے پاس گئی گانے والی باندیاں تھیں جو بہت پُر مذاق تھیں۔ اس کی باندیوں میں ایک باندی "عبّادہ" تھی جس کے عشق میں عبداللہ محمد بن ابی ایوب گرفتار تھا۔ چنانچہ وہ کہتا ہے۔

اگر ابو عمیر ذرا سا بیمار ہو جائے تو ہم مزاج پرسی کرنے کے لئے اس کے ہاں ضرور جائیں۔ اس طرح مزاج پرسی کا حق بھی ادا ہو جائے اور عبّادہ کی سرگیں آنکھیں بھی دیکھنے کو مل جائیں[2]۔

ان میں سے ایک ابو الخطاب نخاس تھا جس کے پاس ایک مغنیہ باندی تھی۔ "ذات الخال" کے لقب سے وہ مشہور تھی۔ ابراہیم موصلی کو اس سے عشق تھا[3]۔ ان میں سے ایک اور نخاس "حرب بن عمرو ثقفی" تھا۔ اس کے پاس بھی ایک گانے والی باندی تھی، بغداد کے شعراء، میر منشی اور اہل ادب برابر اس کے پاس آتے جاتے اور اس کا گانا سنتے تھے۔ اس کے گھر پر بیش قرار رقمیں خرچ کی جاتی تھیں۔ اسے انعامات اور تحائف دیئے جاتے تھے۔ اسی باندی کے بارہ میں اشجع شاعر کہتا ہے۔

میں اپنے پروردگار سے اس کیفیت کی شکایت کرتا ہوں جو مجھے باندی کی محبت اور اس کے مالک کے رقیبانہ بغض کی وجہ سے درپیش ہے۔ اس کے مالک کی عداوت اور خود اس کی محبت کی وجہ سے میں بغض اور محبت کے دوگونہ عذاب سے بیمار ہو رہا ہوں۔ دونوں کیفیتیں میرے سینے میں ہیجان بپا کرتی رہتی ہیں اور میرا دل ان دونوں کیفیتوں میں بٹ کر رہ گیا ہے۔ خدایا! مجھے تو اس باندی کے ذریعہ سے جلد از جلد شفا دیدے اور حرب بن عمرو (مالک) کو جلد از جلد بیمار ڈال دے[4]۔

"ابو دلامہ" شاعر کا ایک نخاس پر گزر ہوا جو غلام اور باندیاں فروخت کر رہا تھا۔ ابو دلامہ نے اس کے پاس ایک

---

[1] مسعودی صفحہ ۱۴۲ جلد ۲
[2] اغانی صفحہ ۵۰ جلد ۱۷
[3] اغانی صفحہ ۴۴ جلد ۲۰
[4] اغانی صفحہ ۱۲۸ جلد ۹

ایک بڑھ کر حسین باندی دیکھی۔ وہ وہاں سے بڑا ہی کبیدہ خاطر لوٹا اور مہدی کے دربار میں حاضر ہو کر اپنا قصیدہ سنایا جس میں اس نے نخاسی کے پیشہ کو شعر گوئی پر ترجیح دی۔ اس قصیدہ کا ترجمہ یہ ہے۔

اگر تو شیریں اور صاف زندگی گزارنا چاہتا ہے تو شعر گوئی ترک کر دے اور نخاس بن جا۔

آزاد منش ادیب نخاسوں پر ان کے پیشہ کی وجہ سے رشک کرتے تھے لیکن اکثر عقلاء اس پیشہ کو ناپسند اور نہایت مکروہ سمجھتے تھے۔ کچھ لوگ امیر معاویہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے ان سے ان کے پیشوں کے متعلق سوال کیا۔ انہوں نے کہا کہ وہ غلام فروخت کرتے ہیں۔ امیر معاویہؓ نے فرمایا کہ یہ تجارت تو بہت ہی بری ہے۔ ایک جان کی ذمہ داری اور اتنا ذرا سا نفع جس سے ڈاڑھ بھی گرم نہ ہو۔[1]

ان غلاموں کی تجارت کرنے والوں پر افسران حکومت میں سے ایک آفیسر مقرر ہوتا تھا جو ان کے اعمال کی نگرانی کرتا اور ان کے تجارتی کاروبار پر کڑی نظر رکھتا تھا۔ اس آفیسر کو "قیم الرقیق" (غلاموں کا منتظم) کہتے تھے۔

یہ غلام مختلف انواع کے ہوا کرتے تھے ان میں سے کچھ تو سیاہ رو ہوتے تھے۔ اس قسم کا اہم ترین بازار مصر، جزیرہ عرب کا جنوبی حصہ اور شمالی افریقہ تھا۔ قافلے جنوب کی طرف سے ان غلاموں کو لے کر جاتے اور سوداگر لے کر آتے تھے۔ ۱۵۰ھ میں ایک غلام کی قیمت عموماً دو سو درہم کے لگ بھگ ہوا کرتی تھی۔ کافور اخشیدی حبشی جو آگے چل کر مصر کا بادشاہ ہوا اپنے ابتدائی زمانہ میں ۳۱۲ھ ہجری میں اٹھارہ دینار (ایک سو اسی درہم) میں فروخت ہوا تھا کیونکہ وہ خصی تھا۔[2] اس کے بارہ میں متنبی نے ناراض ہو کر کہا تھا۔

سیاہ روخصی سے کسی فضیلت کا کون پتہ لگا سکتا ہے۔ کیا اس کی قوم سفید رو ہے یا اس کے آباء اجداد شریف ہیں۔ کیا اس کے کان دیکھیں جو نخاس کے ہاتھ میں خون آلودہ ہو رہے ہیں یا اس کی قدر اور مرتبہ دیکھیں جو یہ ہے کہ دو ٹکے میں فروخت کر دیا جائے تو خریدنے والا اسے واپس کر دے۔ سفید رو جوانمرد بھی آجکل تو اچھے کاموں سے عاجز آ گئے ہیں تو سیاہ روخصی سے کیا توقع کی جا سکتی ہے۔

ان غلاموں میں سے گورے چٹے بھی ہوتے تھے۔ ان میں زیادہ مشہور ترک اور صقلبی تھے۔ لوگ صقلبی غلاموں کو ترکوں سے بہتر سمجھتے تھے۔ یہ بات ہمیں خوارزمی کے اس ایک فقرہ سے معلوم ہوتی ہے جو کتاب "یتیمۃ الدھر" میں انہوں نے لکھا ہے۔ وہ فقرہ یہ ہے۔ "صقلبی غلام نہ ملنے کی صورت میں ترکی غلام سے خدمت لی جاتی ہے۔"[3] گورے غلاموں کی تجارت کی اہم ترین منڈی شہر سمرقند تھا۔ شہر سمرقند اس قسم کے بہترین غلام مہیا کرنے میں بہت مشہور تھا۔ مملکت اسلامیہ میں اور یورپ میں غلاموں کی تجارت بہت بڑھ گئی تھی اور یورپ کے اطراف و جوانب میں انکی تجارت کرنے والے یہودی ہوا کرتے تھے۔[4]

غلاموں کی مختلف انواع اور ہر نوع کے امتیازات

غلاموں کی انواع میں ہر نوع کے خصوصی امتیازات ہوتے تھے

---

[1] عیون الاخبار صفحہ ۲۵۰ جلد ۱ [2] اغانی صفحہ ۲۷ جلد ۲۰ [3] یتیمہ صفحہ ۱۱۶ جلد ۴۔ صقالیہ کا لفظ ان اجناس پر بولا جاتا تھا جو بلغاریہ سے لے کر حدود قسطنطنیہ تک سکونت رکھتے تھے۔ [4] MEZ

جن میں وہ مشہور تھے۔ ہندوستانی باندیاں ناز و انداز، نزاکت، صبر و سکون اور بچوں کی عمدہ پرورش میں مشہور تھیں۔ لیکن وہ بہت جلد لاغر ہو کر سوکھ جاتی تھیں۔ ہندوستانی غلام گھر کے انتظام، دستکاریوں کی مہارت وغیرہ میں مشہور ہوتے تھے لیکن ان میں یہ ہوتا تھا کہ عین جوانی میں وہ یکبارگی مر جاتے تھے۔ ہندوستانی غلام اور باندیاں زیادہ تر "قندھار" سے لائی جاتی تھیں۔ وہ باندیاں جن کی پیدائش مدینہ منورہ میں ہوتی تھی (یعنی وہ باندیاں جن کی نشوونما اور تربیت مدینہ منورہ میں ہوتی تھی) ناز و انداز، ہنس مکھ ہونے، خوش رہنے اور عشق و محبت کی باتیں کرنے میں زیادہ شہرت رکھتی تھیں ان میں بہترین مغنیہ بننے کی عمدہ استعداد ہوتی تھی۔ وہ باندیاں جن کی پیدائش مکہ مکرمہ میں ہوئی ہوتی نازک کلائیوں، اور کھلے جوڑوں اور خمار آلود آنکھوں کی وجہ سے زیادہ شہرت رکھتی تھیں۔ بربری (یعنی مغرب کی) باندیوں کا عمدہ بچے پیدا کرنے میں جواب نہیں تھا۔ ان کی عادات اور اخلاق نرم ہوتے تھے اس لئے ان میں اس کی صلاحیت زیادہ ہوتی تھی کہ جس قسم کے کام کا جی چاہے انہیں عادی بنایا جا سکتا تھا۔ باندیوں کا بلند ترین معیار ——— جیسا کہ ابو عثمان دلال نے بیان کیا ہے ——— یہ تھا کہ "اس کی اصل تو بربر سے ہو مگر اپنی عمر کے نویں سال میں اپنے ملک سے جدا ہو گئی ہو۔ اس کے بعد تین سال تک مدینہ منورہ میں اور اتنے ہی سال مکہ مکرمہ میں رہی ہو۔ اور سولھواں سال لگنے پر عراق میں آ گئی ہو تاکہ یہاں کی تہذیب کے رنگ میں رنگی جائے۔ اس کے بعد جب پچیس سال کی عمر میں اسے فروخت کیا جائے تو اس میں تمام خوبیاں جمع ہو چکی ہوں گی۔ اصل کی عمدگی، مدنی عورتوں کا ناز و انداز، مکی عورتوں کی نزاکت اور عراقی عورتوں کی تہذیب و مدنیت"

سوڈانی غلام تمام بازاروں میں اٹے پڑے رہتے تھے۔ یہ بے صبری اور بے توجہی اور غیر ذمہ داری میں مشہور تھے۔ ساتھ ہی ڈھول بجانے اور ناچنے کی طرف رغبت رکھنے میں بھی ان کی کافی شہرت تھی۔ لعاب کی کثرت کی وجہ سے ان کے دانت خدا کی ساری مخلوق میں سب سے زیادہ سفید اور خوبصورت ہوتے ہیں۔ عموماً ان کی بغل میں بو ہوتی ہے اور چھونے میں جلد کھردری ہوتی ہے۔ ان وجہوں سے انہیں زیادہ پسند نہیں کیا جاتا تھا۔

حبشی باندیاں کمزور اور ڈھیلی ڈھالی ہوتی ہیں ان میں سینہ کے امراض کی زیادہ استعداد ہوتی ہے۔ سوڈانی باندیوں کے برعکس نہ اچھا گا سکتی ہیں نہ ناچ سکتی ہیں لیکن اس کے باوجود اخلاقی اعتبار سے نہایت قوی اور قابل اعتماد ہوتی ہیں۔ وہ اس کی اہل ہیں کہ ان پر اعتماد کیا جائے۔

ترکی باندیاں گوری چٹی، نہایت حسین و جمیل ہوتی ہیں۔ ان کی آنکھیں چھوٹی ہوتی ہیں مگر ان میں ایک قسم کی جاذبیت ہوتی ہے۔ عموماً فربہ اور چھوٹے قد کی ہوتی ہیں۔ ان کے بچے بکثرت ہوتے ہیں۔ شریف اور پاکیزہ ہوتی ہیں۔ استمتاع کے لئے بہترین مگر ساتھ ہی قطعاً بھروسہ اور اعتماد کے قابل نہیں ہوتیں۔

رومی باندیاں گوری چٹی سرخی مائل ہوتی ہیں۔ ان کے بال نہایت عمدہ ہوتے ہیں آنکھیں نیلگوں ہوتی ہیں۔ مطیع و فرمانبردار ہوتی ہیں۔ جس قسم کے حالات میں ہوں ان کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لیتی ہیں۔ مخلص اور قابل اعتماد ہوتی ہیں رومی غلام بھی گھر کا انتظام بہت اچھا کرتے ہیں اور ہر امر میں ضبط و نظم کو پسند کرتے ہیں۔ خرچ کرنے میں میانہ روی ان کا شیوہ ہوتا ہے۔ فنون جمیلہ میں بھی اچھی دستگاہ رکھتے ہیں۔

گوری جنس میں سب سے بدتر ارمنی ہوتے ہیں۔ جسمانی اعتبار سے اچھے ہوتے ہیں مگر ان کے پاؤں نہایت بدشکل

ہوتے ہیں۔ عفت اور پاکدامنی تو جانتے ہی نہیں۔ ان میں چوری عام ہوتی ہے۔ ان کی طبیعت اور بات کرنے کے انداز میں ایک طرح کا کھڑا پن ہوتا ہے۔ اگر تم کسی زنجی کو ذرا دیر کے لئے بے کار چھوڑ دو تو وہ کسی ایذا رسانی کی تیاری میں لگ جائیگا وہ محض ڈر کی وجہ سے کام کرتا ہے۔ لہذا ضروری ہے کہ ہر وقت اس کے لئے لاٹھی اٹھائے رکھو اور ڈانٹتے ڈپٹتے رہو تاکہ تمہاری منشا کے مطابق کام کرتا رہے[۱]۔

بہرحال غلام اور خاص طور سے باندیاں مختلف انواع سے تعلق رکھتی تھیں ہندی، سندھی، مکی، مدنی، سوڈانی، حبشی، ترکی، رومی اور ارمنی ——— جاحظ نے نخاسوں کے پاس غلاموں کے ان انواع کو کبوتروں کے رنگوں سے تشبیہ دی ہے۔ صقلبی باندیوں کو انہوں نے سفید رنگ کی کبوتریوں سے اور زنجی باندیوں کو سیاہ رنگ کی کبوتریوں سے تشبیہ دی ہے[۲] الخ

اس بات نے خلفاء اور امراء کے محلات کو مختلف قومیتوں سے تعلق رکھنے والے غلاموں اور باندیوں کا مرکز بنا دیا تھا۔ ان کی طبیعتیں، عادتیں اور زبانیں مختلف تھیں۔ طبری نے بیان کیا ہے کہ مامون جب فضل پر ناراض ہوا تو اسے مامون کے چار غلاموں نے قتل کیا تھا جن کے نام غالب مسعودی حبشی، قسطنطین رومی، فرج دیلمی اور موفق صقلبی تھے[۳]۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ خلیفہ متوکل کے پاس چار ہزار ممتوعہ باندیاں تھیں جو طبیعت کے لحاظ سے مختلف جنسوں سے تعلق رکھتی تھیں[۴]۔ ایک مرتبہ روز سعانین (انصاری کی عید کا دن) میں احمد بن صدقہ مامون کی خدمت میں حاضر ہوا تو مامون کے حضور میں اس وقت بیس رومی باندیاں دست بستہ کھڑی تھیں۔ ان کے گلوں میں بدھیاں پڑی ہوئی تھیں۔ رومی دیباج کے لباس سے آراستہ پیراستہ تھیں۔ ان کے گلوں میں سونے کی صلیبیں لٹک رہی تھیں۔ اور ہاتھوں میں تنکے اور زیتون لئے ہوئے تھیں۔ مامون نے اس سے کہا۔ احمد! تیرا ناس ہو۔ میں نے ان کے بارہ میں چند اشعار موزوں کئے ہیں۔ ذرا انہیں مجھے گا کر تو سنا دو۔ اس کے بعد مامون نے اشعار سنائے اور ان کا ترجمہ یہ ہے۔

> ہرنیاں ہیں، دیناروں کی طرح سُرخ اور ملیح، اپنے بالاخانوں میں۔ سعانین کی عید نے انہیں بدھیاں پہنا کر ہمارے سامنے اور بھی دمکا دیا ہے۔ کانوں میں ایسے آویزے لٹکا رکھے ہیں جیسے زر زبر کی لوئیں۔ زنیور کی پتلی اور نازک کمر کی طرح نازک اور پتلی کمروں کے ساتھ آرہی ہیں۔

احمد نے یہ اشعار مامون کو گا کر سنائے وہ شراب پیتا رہا اور باندیاں اس کے سامنے رقص کرتی رہیں[۵]۔

مروان ابن ابی حفصہ نے ہارون رشید کی مدح میں ایک قصیدہ کہا تو ہارون رشید نے اسے مال و دولت اور دس رومی غلام انعام میں مرحمت فرمائے[۶]۔ محمد بن شفوت ہاشمی کے پاس تین گانے والے غلام تھے۔ ان میں سے دو

۱۔ یہ ٹکڑا ہم نے MEZ کی کتاب سے ترجمہ کیا ہے جو در حقیقت اس کا خلاصہ بھی ہے MEZ نے یہ باتیں ایک رسالہ سے نقل کی ہیں جو ابن بطلان نے غلام خریدنے کے بارہ میں تصنیف کیا تھا۔ یہ رسالہ برلن کی لائبریری میں محفوظ ہے۔ ہمیں مصر میں اس کی عربی اصل نہیں مل سکی۔ ۲۔ الحیوان صفحہ ۷ جلد ۳

۳۔ ابن جریر صفحہ ۲۵۰ جلد ۱۰ ۴۔ مسعودی صفحہ ۳۰۸ جلد ۲

۵۔ اغانی صفحہ ۱۳۸ جلد ۱۹ ۶۔ طبری صفحہ ۱۱۴ جلد ۱۰

صقلبی تھے۔ خاقان اور حسین۔ خاقان بہترین گویا تھا اور حسین درمیانہ درجہ کا گویا تھا مگر وہ اس کے ساتھ بہترین سازندہ بھی تھا۔ تیسرا غلام جس کا نام حجاج تھا نہایت حسین اور رومی طرز پر گانے والا تھا [1]

بشار کے پاس ایک سیاہ رنگ کی باندی تھی جس کے بارہ میں وہ کہتا ہے۔

بعض نازک اندام، سیاہ پانی کی طرح چمکدار، عمدہ اور نرم لڑکیاں ایسی ہیں گویا کہ وہ اپنے مالک کے لئے مشک کی طرح گوندے ہوئے عنبر سے ڈھال کر بنائی گئی ہیں۔

ابوالشیص شاعر کے پاس ایک سیاہ رنگ کی باندی تھی جس سے اُسے عشق تھا۔ اس کے بارہ میں وہ کہتا ہے۔

خوشبودار مشک کے چچا کی لڑکی اور وہ کہ اگر تو نہ ہوتی تو نہ مشک بنائی جاتی اور نہ وہ خوشبو دیتی سیاہی اور خوشبو میں مشک کو تیرے ساتھ نسبت ہے اور کتنی اچھی ہے یہ نسبت [2]

ابراہیم ابن مہدی کے پاس ایک رومی باندی تھی جو گھر کی صفائی کرتی تھی اور عربی اچھی طرح نہیں بول سکتی تھی [3] مہدی کے پاس ایک نصرانی لونڈی تھی جو ہر وقت اپنے سینہ پر سونے کی ایک صلیب لٹکائے رہتی تھی [4] بہرحال اس کی مثالیں بہت دی جاسکتی ہیں ——— اس سے آپ نے دیکھ لیا کہ اکثر کوئی گھر بھی کسی نہ کسی باندی یا غلام سے خالی نہیں ہوتا تھا۔ اور وہ مختلف جنسوں، مختلف مذاہب اور مختلف تہذیبوں سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ نے تصریحات بالا سے یہ بھی دیکھ لیا کہ خلفاء اور امراء نے اپنے ان غلاموں اور باندیوں کو دین و مذہب کی پوری آزادی دے رکھی تھی۔ بعض مرتبہ لونڈی نصرانی ہوتی تھی اور وہ صلیب اور زنار پہنتی تھی۔ وہ اپنا قومی لباس پہنتی اور اپنی زبان میں گفتگو کرتی تھی کیونکہ اسے عربی بولنی نہیں آتی تھی۔ ان باتوں کے اپنے نتائج تھے جن پر ہم آگے چل کر تبصرہ کریں گے۔ (جاری ہے)

---

[1] اغانی صفحہ ۵۳ جلد ۱۵ [2] اغانی صفحہ ۱۱۱ جلد ۱۵ [3] اغانی صفحہ ۷۱ جلد ۹
[4] طبری صفحہ ۲۰ جلد ۱۰

رابطۂ باہمی

قرآنی برادری میں ایک اور اضافہ

بورے والا (ضلع وہاڑی) کے قرآنی احباب نے اپنے ہاں بزم طلوعِ اسلام قائم کر لی ہے اور محترم محمد اسلم صابر صاحب کو اپنا نمائندہ منتخب کیا ہے۔ ادارہ اس بزم کے قیام اور اس کے منتخب نمائندہ کی توثیق کرتے ہوئے دست بدعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنی کتابِ عظیم کی فکر و تعلیم کی اشاعت کی بیش از پیش توفیق عطا فرمائے۔ بزم نے ریکارڈ شدہ درس قرآن مجید کا سلسلہ بھی جاری کر رکھا ہے۔ پتہ حسبِ ذیل ہے:۔

محلہ مرضی پورہ۔ گلی ۵۔ تیسرا چوک۔ ملتان روڈ۔ بورے والا (ناظم)

باسمہٖ تعالیٰ

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود!!
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

قوموں کی تعمیر فکر سے ہوتی ہے

نہ ہنگاموں سے نہ تعزیرات سے

پرویز

قوموں کی تعمیر فکر سے ہوتی ہے

(نہ ہنگاموں سے، نہ تعزیرات سے)

پرویز صاحب کی ساری عمر "محاذ آرائی" میں بسر ہوئی ہے۔ یہ محاذ آرائی ہنگامہ خیزی کی نہیں۔ نظریات کی جنگ ہے۔ تحریکِ پاکستان کے دوران انہیں نیشنلسٹ علماء کے خلاف محاذ قائم کرنا پڑا۔ اُن کا موقف یہ تھا کہ (۱) قومیت کا مدار، وطن کا اشتراک ہے۔ ہندوستان میں بسنے والے مسلمان اور غیر مسلم، اشتراکِ وطن کی بنا پر ایک قوم ہیں۔ اور (۲) اسلام پر، ہر قسم کی حکومت کے تابع، عمل پیرا ہوا جا سکتا ہے۔ ان کے برعکس پرویز صاحب کا (قرآنِ کریم کی روشنی میں) نظریہ یہ تھا کہ اسلام میں قومیت کا مدار ایمان کا اشتراک ہے، نہ کہ، وطن۔ رنگ۔ نسل۔ زبان وغیرہ کا اشتراک۔ اور اسلام نام ہے قرآن کریم کے اصول، اقدار اور قوانین کے عملاً نافذ کرنے کا، جو صرف اپنی آزاد مملکت میں ممکن ہے۔ مطالبۂ پاکستان کی بنیاد یہی قرآنی حقیقت تھی، جسے کامیابی نصیب ہوئی اور ہمیں، اس قسم کی مملکت قائم کرنے کے لئے ایک خطۂ زمین مل گیا۔

تشکیلِ پاکستان کے فوری بعد پرویز صاحب نے اربابِ اقتدار سے کہا کہ تحریکِ پاکستان کے دوران ہمارا سارا وقت اور توانائی اس جنگ کے لڑنے میں صرف ہو گئے تھے اور وہاں اتنی فرصت ہی نہیں مل سکی تھی کہ مسلمانوں میں وہ فکری تبدیلی پیدا کی جا سکے جس سے وہ ایمان کے اشتراک کی بنا پر ایک قوم بن سکتے، اور اس قابل ہو سکتے کہ اس خطۂ زمین میں اس انداز کی مملکت قائم کر سکتے جو اس کے حصول کا مقصود تھی۔ (انہوں نے کہا کہ) قوم کے بڑے بوڑھوں کے ذمہ تو یہ فریضہ عائد کیجئے کہ وہ اس خطۂ زمین کو ہر قسم کے خطرات سے محفوظ رکھ سکیں۔ اور نئی نسل کی تعلیم و تربیت اس انداز سے کی جائے کہ ان میں وہ فکری تبدیلی پیدا ہو جائے جس سے اس مقصد کا حصول ممکن ہو جس کے لئے یہ جداگانہ مملکت قائم کی گئی ہے

لیکن ان کی اس آواز کو (جسے وہ مسلسل اور متواتر دہراتے رہے) کسی نے درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ اور یہاں کی نئی نسل کو بے زمام چھوڑ دیا کہ وہ جو فساد اسے جی چاہے اختیار کرے۔ اس کے ساتھ ہی (ہماری بدقسمتی سے) وہ تمام عناصر ہجوم کر کے پاکستان میں در آئے جنہوں نے مطالبۂ پاکستان کی سرتوڑ مخالفت کی تھی اور آخر الامر شکست اٹھائی تھی۔ ان کا مقصد اپنی شکست کا انتقام لینا اور پاکستان کو ناکام بنا کر

یہ ثابت کرنا تھا کہ وہ اس کی مخالفت میں حق بجانب تھے۔ ان کا حربہ ایسے حالات پیدا کرتے رہنا تھا جس سے ملک خلفشار اور انتشار کا شکار ہوتا رہے۔ ہنگامہ اور فسادات برپا ہوتے رہیں۔ اور لاقانونیت پھیلتی رہے۔ "سپر پاورز" اس قسم کے مواقع کی تلاش میں رہتی ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اس فتنہ کو برقرار رکھنے اور فروغ دینے میں ہر ممکن مدد کی۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ کس طرح آئے دن (تبلیغ کے بہانے) ان ممالک کا چکر لگاتے رہتے ہیں۔ یہ سب کچھ مذہب کے نام اور اسلام کے نقاب میں ہوتا رہا۔ اس کا واحد اور مؤثر علاج وہی فکری تبدیلی تھی لیکن اس کی طرف کسی نے توجہ نہ کی اور تعزیرات کے ذریعے ان ہنگامہ آرائیوں کو دبانے کی کوشش کی جاتی رہی جو ظاہر ہے کہ ناکام رہی۔

یہ ہنگامہ آرائیاں ویسے تو معمول کے مطابق مسلسل رواں دواں رہتی تھیں لیکن وقتاً فوقتاً ان کی رفتار میں تیزی پیدا کرنے کے لئے، ان میں بحرانی کیفیت پیدا کر دی جاتی تھی۔ پرویز صاحب ایسے مقامات پر قوم کو خاص طور پر مخاطب کرتے اور کہتے کہ قوموں کی تعمیر فکر سے ہوتی ہے، ہنگامہ آرائیوں سے نہیں۔ اور ارباب اقتدار سے کہتے ہیں کہ معاشرہ کی اصلاح تعزیرات سے نہیں ہو سکتی۔ ذہنیت کی تبدیلی سے ہو سکتی ہے۔ چنانچہ جب ۱۹۶۸-۶۹ء میں ملک میں اسی قسم کا بحران پیدا ہوا تو انہوں نے ایک خصوصی خطاب کے ذریعے اس حقیقت کو نمایاں کیا۔ پھر جب ۱۹۷۷ء میں فسادات کا یہ سیلاب دوبارہ اُمنڈا تو اس خطاب کا اعادہ کیا گیا۔ اب ملک پھر تشتت و اضطراب کا شکار ہو رہا ہے تو ہم نے مناسب سمجھا کہ اس خطاب کو (پرویز صاحب کی نظر ثانی کے بعد) ایک بار پھر شائع کیا جائے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس خطاب میں، مرض کی علامات کے علاج پر زور نہیں دیا گیا۔ علتِ مرض کی تشخیص کی گئی ہے اور ایسے حقائق کو سامنے لایا گیا ہے جن کا تعلق بنیادی طور پر سیاستِ مدن اور عمرانیات سے ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اربابِ دانش و بینش اس کی اشاعت کو مفید پائیں گے۔

(طلوعِ اسلام)

خطاب

حیوان اور انسان میں ایک (اور میرے نزدیک سب سے اہم، بنیادی) فرق یہ ہے کہ انسان کو عقل و فکر کی صلاحیتوں سے نوازا گیا ہے۔ حیوان کے ہر عمل کا جذبۂ محرکہ، جبلّی تقاضا (INSTINCTIVE URGE) ہوتا ہے ——— اسی کو، آگے بڑھ کر انسانی زندگی میں جذبات سے تعبیر کیا جاتا ہے ——— حیوانات کے برعکس، انسان کے سامنے جب کوئی معاملہ آئے تو اس کی انسانیت کا تقاضا ہے کہ وہ اس پر عقل و بصیرت کی روشنی میں غور و فکر کرے، اس کے موافق اور مخالف پہلوؤں کا، دلائل و براہین کی رُو سے، موازنہ کرے۔ تجربات اور مشاہدات کے فراہم کردہ نتائج کو سامنے رکھ کر، اس کے انجام و عواقب پر نگاہ ڈالے، اور اس طرح، امکان بھر تدبّر و تفکّر کے بعد، نہایت ٹھنڈے دل سے کسی فیصلے پر پہنچے۔ حیوان کے پیشِ نظر مقصد کے راستے میں جب کوئی موانعات آتے ہیں تو اس کے جذبات میں شدّت آجاتی ہے۔

بالفاظِ دیگر یوں کہئیے کہ اس کا غصّہ تیز ہو جاتا ہے —— اس لئے کہ اس کے پاس، اس کے سوا، مدافعت کا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا۔ لیکن انسان کی انسانیت کا تقاضا ہے کہ جب اس کی راہ میں دشواریاں حائل ہوں تو ان پر اور بھی زیادہ ٹھنڈے دل سے غور کرے اور کامل سکون و اطمینان سے ان کا حل سوچے۔ حیوانات کے جبلّی تقاضوں پر فطرت کی طرف سے کنٹرول عائد ہوتا ہے۔ بڑے سے بڑا خونخوار درندہ بھی جبتک اسے اپنی حفاظت کے متعلق کسی خطرہ کا احساس نہ ہو، یا اسے بھوک نہ ستائے، کسی پر حملہ نہیں کرتا جب کسی بیل کا پیٹ بھر جاتا ہے تو پھر اسے اس کی پرواہ نہیں رہتی کہ باقی ماندہ چارہ کون کھا رہا ہے حتیٰ کہ حیوانات کا جنسی تقاضا بھی —— جسے جبلّی تقاضوں میں شدید ترین تصوّر کیا جاتا ہے —— فطرت کے اشارے کے بغیر بیدار نہیں ہوتا۔ لیکن انسان کے جبلّی تقاضوں، یعنی جذبات پر، فطرت نے اپنا کنٹرول عائد نہیں کیا۔ اسے اپنے جذبات پر خود کنٹرول عائد کرنا پڑتا ہے۔

فطرت کا کنٹرول نہیں

اور یہ کنٹرول عقل و فکر کی رُو ہی سے عائد کیا جا سکتا ہے۔ لفظ عقل کے بنیادی معنی روکنے کے ہیں جس رسّی سے اونٹ کے گھٹنے کو باندھ دیا جاتا تھا کہ وہ بھاگ نہ جائے، عرب اسے عقال کہتے تھے۔ جب اونٹ چلتا تو وہ اس رسّی کو کھول کر اپنے سر پر لپیٹ لیتے کہ بوقتِ ضرورت آسانی سے ہاتھ میں آ جائے۔ رفتہ رفتہ یہ رسّی عربوں کے لباس کا جزو بن گئی۔ اسے بھی عقال کہا جاتا ہے۔ بہرحال، کہا یہ جا رہا تھا کہ عقل کا فریضہ یہ تھا کہ وہ انسانی جذبات کو حد سے بڑھنے سے روک دے۔ یہ چیز خاصّہ انسانیت ہے۔ بنابریں عقل و فکر اور دانش و بینش، باعثِ شرفِ آدمیت اور موجبِ جوہرِ انسانیت ہیں، اور جبلّی تقاضوں (جذبات) کی بے باکی، حیوانیت سے بھی پست سطح زندگی کی مظہر۔

جہاں تک طبیعی قوتوں کا تعلق ہے، انسان، حیوانات کے مقابلے میں کمزور واقع ہوا ہے —— نہ اُسے ہاتھی جیسی طاقت حاصل ہے، نہ شیر جیسی قوتِ درندگی۔ نہ یہ ہرن جتنا تیز دوڑ سکتا ہے، نہ عقاب جیسا بلند اُڑ سکتا —— لیکن وہ ان تمام حیوانات کو اپنی عقل و فراست کے زور سے مغلوب اور تابع فرمان بنا سکتا ہے۔

فطرت کی طرف سے سب انسان، یکساں واجب التکریم پیدا ہوئے تھے لیکن جب انسانی معاشرہ میں "میری اور تیری" کی تفریق و تخصیص پیدا ہوئی تو ان لوگوں نے، جو اپنی ہوسِ اقتدار کو حدود فراموش اور اپنے جذبۂ حرص و آز کو قیود ناآشنا بنانا چاہتے تھے، اس سوال پر غور کیا کہ اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کو کس طرح اپنا تابع فرمان بنا کر ان کی محنت کے ماحصل کو غصب (EXPLOIT) کیا جائے۔ انہوں نے دیکھا کہ بڑے بڑے عظیم الجثہ حیوانات کو اس لئے مغلوب کر لیا جا سکتا ہے کہ وہ عقل و فکر سے عاری ہوتے ہیں۔ اس لئے دوسرے انسانوں کو اپنا مطیع اور فرمان پذیر بنانے کا آسان ترین طریقہ یہ ہے کہ انہیں کسی طرح عقل و فکر سے بیگانہ بنا دیا جائے۔ ان کی سمجھنے سوچنے کی صلاحیتوں کو مفلوج، اور رفتہ رفتہ مصلوب کر دیا جائے۔

آپ تاریخ انسانیت پر غور کیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ انسانوں میں، باہمی کش مکش یعنی عقول کی جنگ (BATTLE OF WITS) مسلسل چلی آ رہی ہے۔ حاکم و محکوم، آمر و مامور، مطاع و مطیع، مقتدیٰ و مقتدی، آجر و مستاجر، محتاج و مستغنی کی تفریق و تمیز، اسی کش مکش پیہم کے مختلف مظاہر ہیں۔ جو زیادہ زیرک اور چالاک تھے انہوں نے ایسے انداز اور طریقے وضع کئے جن سے ان لوگوں کو جو نسبتاً کم عقل و فہم کے مالک تھے، اپنے دامِ تزویر میں لے آئے، اور اس طرح گوشۂ سیاست میں حاکم و آمر، دنیائے مذہب میں مطاع و مقتدیٰ اور جہانِ معیشت میں رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی اور آن داتا بن بیٹھے۔ اس کے بعد ایسا انتظام کیا کہ محکوم و مطیع و محتاج طبقہ کی فکری صلاحیتیں ابھرنے نہ پائیں۔ اس نظام کو جس کی رُو سے انسانوں کی عقل و فکر کے چراغ گل کئے جاتے ہیں، "مذہب" کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ آپ اس لفظ کو سُن کر شاید چونک اُٹھیں، کیونکہ مذہب کا تصوّر

اسے مذہب کہتے ہیں

تو عام طور پر کچھ اور ہوتا ہے لیکن جو کچھ کہا گیا ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے ——— مذہب، نجات حاصل کرنے کے ذریعہ ہی کا نام نہیں۔ یہ تو مذہب کا ایک گوشہ ہے۔ ہر وہ نظام جو عقل و فکر کی صلاحیتوں کو مفلوج کر کے انسانوں کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کا تابع فرمان بنائے مذہب کہلائے گا۔ خدا کی طرف سے عطا کردہ دین، اس نظام کے خلاف چیلنج ہوتا ہے۔ وہ سب سے پہلے یہ اعلان کرتا ہے کہ

دینِ خداوندی

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ..... (۳/۷۸)

کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں ——— خواہ اسے ضابطۂ قوانین، حکومت اور نبوّت بھی حاصل کیوں نہ ہو ——— کہ وہ دوسرے لوگوں سے کہے کہ تم اللہ کے نہیں، بلکہ میرے محکوم اور فرماں پذیر بن جاؤ۔

یہ دین کا سب سے پہلا اعلان ہوتا ہے جسے وہ بغرضِ اختصار، لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، کے نظریۂ حیات کی شکل میں پیش کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ جب دنیائے انسانیت میں ایسا عظیم انقلاب لائے گا تو وہ سب سے پہلے، اس اصل و بنیاد کو اکھیڑے گا جس پر انسانی تغلب، استبداد اور استحصال کی عمارت استوار ہوتی ہے ——— یعنی فرعونیت (سیاسی استبداد) ہامانیت (مذہبی اقتدار) اور قارونیت (معاشی استحصال) کی عمارت ——— وہ اُن اغلال و سلاسل کو توڑے گا جن میں انسانی عقل و فکر کو جکڑ دیا گیا تھا۔ اور ان بہتانی سلوں کو اٹھا کر پھینک دے گا جن کے نیچے عقل و شعور کو دبا کر مفلوج کر دیا گیا تھا۔ قرآن کریم نے جب حضور نبی اکرمؐ کی بعثت کا مقصد یہ بتایا کہ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ (۷/۱۵۷) تو اس کا مفہوم یہی تھا۔ یعنی انسانوں کو ان شکنجوں سے آزاد کر کے، وہ ایسا انتظام کرے گا کہ ان کی فکری صلاحیتیں نشوونما

پائی ہوئی بلند سے بلند تر ہوتی جائیں تاکہ کوئی انسان دوسرے انسان کو اپنا محکوم و مطیع بنا کر، ان کی محنت کو غصب نہ کر سکے۔

قرآنِ کریم نے (سورۃ البلد میں) دین کی غرض و غائت، اس کے منتہیٰ و مقصود کو دو لفظوں میں سمٹا کر رکھ دیا ہے۔ پہلے اس نے کہا کہ صحیح راستہ وہی ہے جسے خدا نے متعیّن کیا ہے۔ یعنی الدّین۔ لیکن یہ راستہ اَلْعَقَبَۃُ ہے۔ یعنی پہاڑ کی چوٹی پر چڑھنے کے مرادف۔ اس کے بعد کہا کہ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ـــــ یہ اَلْعَقَبَۃُ کیا ہے؟ کہا فَكُّ رَقَبَةٍ (۹۰/۱۳) نوعِ انسانی کو غلامی کے پھندوں سے آزاد کرانا۔ ظاہر ہے کہ انسانوں کو آزادی دلانے کی صورت یہ ہوگی کہ جن قوتوں نے ان کی عقل و فکر کی صلاحیتوں کو سلب کر رکھا ہو، انہیں مغلوب کر کے اِن محکوموں اور غلاموں کی صلاحیتوں کو اذنِ بال کشائی دیا جائے۔

عقل و فکر کی عظمت

آپ قرآنِ کریم کو اٹھا کر دیکھئے۔ اس کے ورق ورق پر عقل و شعور کی اہمیت اور فہم و فراست کی عظمت، تابندہ حروف میں لکھی ملے گی۔ سورۂ اعراف میں ہے کہ آؤ! تمہیں بتائیں کہ جہنّم کے مستوجب کون لوگ ہیں۔ وہ: لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا..... جو سینے میں دل (سوچنے سمجھنے کی صلاحیت) تو رکھتے ہیں، لیکن عقل و فکر سے کام نہیں لیتے: وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا..... جو آنکھیں تو رکھتے ہیں لیکن ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا..... جو کان تو رکھتے ہیں لیکن ان سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ..... یہ لوگ، انسان نہیں حیوانات کے مانند ہوتے ہیں۔ بَلْ هُمْ اَضَلُّ..... بلکہ اُن سے بھی زیادہ راہ گم کردہ۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ (۷/۱۷۹) اس لئے کہ یہ ذرائع علم رکھنے کے باوجود بے خبر اور بے علم رہتے ہیں۔ دوسری جگہ ہے کہ جہنّم میں داخل ہونے والوں سے اس کا داروغہ پوچھے گا کہ تم کس جرم کی پاداش میں یہاں آ گئے؟ وہ جواب میں کہیں گے کہ اس جرم کی پاداش میں کہ جو لوگ ہم سے عقل و فکر سے کام لینے کے لئے کہتے تھے، ہم ان کی بات نہیں سنتے تھے۔ لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ۔ (۶۷/۱۰) اگر ہم ان کی بات سنتے اور عقل و فکر سے کام لیتے تو ہمارا شمار اہلِ جہنّم میں کیوں ہوتا۔

عقل و فکر سے کام نہ لینے والے ایک تو وہی ہیں جن کی عقل و فکر کی صلاحیتوں کو مستبد قوتوں نے سلب کر رکھا ہو، ان کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ دوسرا طبقہ وہ ہے جو عقل و فکر سے کام لینے کے بجائے اپنے بے باک جذبات کے پیچھے چلیں۔ ان کا شمار بھی اہلِ جہنّم میں ہوتا ہے۔ سورۂ یٰسین میں ہے کہ ان لوگوں سے کہا جائے گا کہ تمہیں متنبہ کیا گیا تھا کہ اپنے بے باک جذبات کے پیچھے نہ لگنا اور عقل و فکر سے کام لینا۔ تم نے ایسا نہ کیا تو اس کا نتیجہ یہ جہنّم ہے جس سے تمہیں پہلے متنبہ کر دیا گیا تھا۔ (۳۶/۶۰) آسمانی انقلاب کے اس پیامبرِ عظیم نے اپنی دعوت پیش کی تو کہا کہ: اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۭ (۱۲/۱۰۸) میں جو تمہیں خدا کے راستے کی طرف آنے کی دعوت دیتا ہوں تو علیٰ وجہ البصیرت دیتا ہوں۔ میں بھی ایسا

کرتا ہوں اور میرے متبعین کی بھی یہی روش ہوگی۔ تم اس پر عقل و فکر کی رُو سے غور کرو۔ علم و بصیرت کی روشنی میں اسے پرکھو۔ اگر تم اس طرح اس کی صداقت پر مطمئن ہو جاؤ تو قلب و دماغ کی کامل رضامندی سے اس کا اعتراف کرو (اسے ایمان کہا جاتا ہے) اس میں کسی قسم کا جبر و اکراہ نہیں، جبر و استبداد نہیں۔ قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (۱۸/۲۹) اے رسولؐ! تم ان سے کہہ دو، کہ حق تمہارے رب کی طرف سے آگیا ہے۔ اب تم میں سے جس کا جی چاہے اسے قبول کرلے، جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔

دین میں جبر نہیں

واضح رہے کہ قرآن کریم نے جب کہا ہے کہ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (۲/۲۵۶) تو اس کے یہی معنی نہیں کہ تم سے دین بزورِ شمشیر نہیں منوایا جائے گا۔ یہ تو جبر و اکراہ کی ایک شکل ہے۔ اس سے کہیں زیادہ جبر و اکراہ یہ ہے کہ انسانی عقل و فکر کو مفلوج کر کے کسی سے کوئی بات منوا لی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ دین اپنے آپ کو فوق الفطرت معجزات اور محیر العقول کرامات کے زور سے نہیں منواتا۔ قرآن کے اوّلین مخاطب، جو مذہب کے خوگر تھے، رسول اللہؐ سے بار بار معجزات طلب کرتے رہے اور حضورؐ ان سے ہر بار یہی فرماتے رہے کہ میں تم سے کہتا ہوں کہ تم اپنی عقل و فکر سے کام لے کر دیکھو کہ میری دعوت، حق و صداقت پر مبنی ہے یا نہیں۔ اور تم چاہتے ہو کہ میں تمہاری سمجھنے سوچنے کی صلاحیتوں کو مفلوج کر کے، تم سے اپنی بات منوا لوں۔ تم عجیب قسم کے انسان ہو؟ چنانچہ آپ ان سے تاکیداً فرماتے کہ انسانی زندگی کا یہ بنیادی اصول یاد رکھو کہ لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ۔ جس بات کا تمہیں علم نہ ہو اس بات کے پیچھے مت لگا کرو۔ یاد رکھو! اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا (۱۷/۳۶)۔ سماعت، بصارت اور فہم و ادراک، ہر ایک سے پوچھا جائے گا کہ تم نے پوری تحقیق کے بعد ایسا فیصلہ کیا تھا؟ رسول اللہؐ اپنی دعوت کو عقل و بصیرت کی رُو سے پیش فرماتے اور اپنے مخالفین سے کہتے کہ: هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۲/۱۱۱) تم اگر سچے ہو تو اپنے دعویٰ کی تائید میں دلیل و برہان پیش کرو۔ دھاندلی سے نہ میں کوئی بات منوانا چاہتا ہوں، نہ تم منواؤ، میں بھی اپنی بات کی تائید میں دلائل و براہین پیش کرتا ہوں، تم اگر اسے ردّ کرتے ہو تو تم بھی دلیل و برہان کی رُو سے ایسا کرو۔

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ قرآن کریم عقل و فکر کو کس قدر اہمیت دیتا ہے۔ اس سلسلہ میں سورۂ سبا کی ایک آیت ایسی جامع ہے جس میں قرآن نے تمام تفاصیل کو چند الفاظ میں سمٹا کر رکھ دیا ہے، اور اگر کہا جائے کہ وہ اس باب میں حرفِ آخر ہے تو اس میں کچھ بھی مبالغہ نہیں ہوگا۔ نبی اکرمؐ عمر بھر اپنی دعوت کو پیش کرتے رہے، اس کے لئے آپؐ نے مختلف طرق و اسالیب اختیار فرمائے۔ یہ ظاہر ہے کہ قرآنی تعلیم کے متنوع گوشے ہیں۔ یہ انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کو محیط ہے اس کی تعلیم کی وسعتیں حدود و فراموش اور اس کے موضوع قیود نا آشنا ہیں۔ لیکن

سوچا کرو

آپ غور کیجئے کہ اس قسم کی تعلیم کا مبلّغ اپنے مخاطبین سے کہتا ہے کہ میں تم سے کوئی لمبی چوڑی باتیں نہیں کرنا چاہتا۔ میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ صرف ایک بات: قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ .... آپ اندازہ لگائیے کہ وہ بات کس قدر اہم اور بنیادی ہوگی۔ وہ ایسی بات ہوگی جس میں اسلام کی ساری تعلیم کا نچوڑ آجائے ـــــ ظاہر ہے کہ ایسی بات سننے کے لئے ہر مخاطب آمادہ ہو جائے گا۔ اس کے بعد آپؐ ان سے کہتے ہیں کہ: اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى۔ اس بات کے سننے کے لئے اگر تم سب کے سب رُکنا نہیں چاہتے تو تمہاری مرضی۔ تم ایک ایک دو دو کر کے ہی رُک جاؤ، اور اللہ کے لئے کھڑے ہو جاؤ۔ جب آپؐ نے اس طرح ان کی توجہات کو اپنی طرف مرکوز کر لیا تو فرمایا کہ وہ ایک بات جو میں تم سے کہنا چاہتا ہوں، یہ ہے کہ: تَتَفَكَّرُوْا (۳۴/۴۶) تم سوچا کرو۔ غور و فکر کیا کرو۔ عقل و بینش سے کام لیا کرو۔ بس یہی تھی وہ ایک بات جو میں تم سے کہنا چاہتا تھا۔ اگر تم نے عقل و فکر سے کام لینا شروع کر دیا تو میرا مرحلہ آسان ہو گیا۔

مومن کسے کہتے ہیں؟

آپ کو معلوم ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے مومن کی بنیادی خصوصیت کیا ہے؟ یعنی وہ خصوصیت جس کے بغیر ایک انسان، مومن نہیں کہلا سکتا۔ سنیئے اور غور سے سنیئے۔

وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا (۲۵/۷۳)

مومن وہ ہیں کہ، اور تو اور، جب ان کے سامنے آیاتِ خداوندی بھی پیش کی جاتی ہیں تو وہ ان پر بھی بہرے اور اندھے بن کر نہیں گر پڑتے۔

یہ ہے مومن کی بنیادی خصوصیت ـــــ ہمارے ہاں لفظِ ایمان کا" انگریزی زبان میں ترجمہ ـــــ (FAITH) کیا جاتا ہے۔ یہ غلط ہے۔ ایمان (FAITH) یعنی اندھی عقیدت نہیں۔ یہ اس اعترافِ حقیقت کا نام ہے جو دل و دماغ کے پورے اطمینان کے بعد، عقل و فکر کی رُو سے کیا جائے۔ اسے آپ (CONVICTION) کہہ سکتے ہیں۔ مذہب کی بنیاد (FAITH) یعنی اندھے یقین پر ہوتی ہے۔ دین علیٰ وجہ البصیرت (BY CONVICTION) اختیار کیا جاتا ہے۔ مذہب کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ:-

بمے سجادہ رنگیں کن گرت پیرِ مغاں گوید — کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسم منزلہا

اور دین یہ کہتا ہے کہ سالک تو ایک طرف، تم خدا کی بات بھی سوچے سمجھے بغیر نہ مانو۔ اس سے واضح ہے کہ دین، درحقیقت، مذہب کے خلاف چیلنج ہے۔ ضمناً، اس سے یہ حقیقت بھی آپ کے سامنے آگئی ہوگی کہ میں نے جو اپنی کتاب کا نام (ISLAM — A CHALLENGE TO RELTGION) رکھا ہے تو وہ قرآن ہی کی پیش کردہ حقیقت پر مبنی ہے۔

جذبات، عقل اور وحی

قرآن کریم نے جذبات اور عقل اور وحی کے تعلقات کو، دو آیات میں، اپنے مخصوص حسنِ ایجاز کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔

سورۂ جاثیہ میں ہے: اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ۔ کیا تُو نے اس شخص، یا اس قوم کی حالت پر بھی غور کیا ہے جس نے اپنے جذبات ہی کو اپنا خدا بنا لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ۔ وہ علم و بصیرت رکھنے کے باوجود صحیح راستے سے بھٹک گیا۔ وَخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً۔ اور اس کے سُننے، دیکھنے، سمجھنے، سوچنے کی صلاحیتیں مفلوج ہو گئیں۔ فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ..... (۴۵/۲۳) جو اس طرح جذبات سے مغلوب ہو جائے اسے صحیح راستہ کون دکھا سکتا ہے؟ یعنی جب انسان جذبات سے مغلوب ہو جاتا ہے تو اس کا علم اسے کچھ فائدہ نہیں دیتا، اور اس کی فکر و دانش کی صلاحیتیں ناکارہ ہو جاتی ہیں۔ دوسری جگہ ہے کہ تم تاریخ کے شواہد پر غور کرو۔ اس میں تمہیں ایسی قومیں دکھائی دیں گی جو بڑی بڑی وسیع و عریض سلطنتوں کی مالک تھیں۔ نہایت درخشندہ و تابناک تہذیب کی حامل تھیں۔ علم و فضل میں ان کا مقام بہت بلند تھا۔ ان کے سمجھنے سوچنے کی صلاحیتیں بڑی نمایاں تھیں۔ لیکن اس کے باوجود، وہ تباہ و برباد ہو گئیں۔ یہ اس لئے کہ انہوں نے اپنے علم و عقل کو مستقل اقدارِ خداوندی کے تابع نہ رکھا۔ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَآ اَبْصَارُهُمْ وَلَآ اَفْـِٕدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ..... (۴۶/۲۶) جب انہوں نے اقدار و قوانینِ خداوندی سے انکار کیا اور سرکشی برتی تو ان کا علم و بصیرت ان کے کسی کام نہ آیا اور وہ تباہی کے جہنم میں جا گریں۔ اس دعویٰ کی شہادت کے لئے ہمیں تاریخ کے اوراق کو پیچھے کی طرف الٹنے کی ضرورت نہیں۔ خود ہمارے زمانے میں اقوامِ مغرب کی حالت اس کی شاہد ہے۔ علم و عقل کا یہ عالم کہ اس سے پہلے کوئی قوم شاید ہی اس بلندی پر پہنچ پائی ہو، اور اس کے باوجود جہنمی زندگی کی یہ کیفیت کہ شاید ہی کوئی قلب ایسا ہو جس میں اس کے شعلے نہ بھڑکتے ہوں۔ یہ اس لئے کہ ان اقوام نے اپنے حیوانی جذبات کو عقل و بصیرت کے تابع نہیں رکھا اور عقل و بصیرت سے مستقل اقدارِ خداوندی کی روشنی میں کام نہیں لیا۔ اقبالؒ کے الفاظ میں، عصرِ حاضر کے انسان کی کیفیت یہ ہے کہ ؎

عشق ناپید و خرد می گزدش صورتِ مار — عقل کو تابعِ فرمانِ نظر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا — اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا!

ان تصریحات سے واضح ہے کہ دین کا اساسی اصول یہ ہے کہ انسانی جذبات کو عقل و بصیرت کے تابع رکھا جائے اور عقل و بصیرت سے اقدار و قوانینِ خداوندی کی روشنی میں کام لیا جائے جو وحی کی رُو سے ملتا ہے۔

(۰)

یہ تھا وہ دین جسے خدا نے نوعِ انسان کی راہ نمائی کے لئے دیا تھا۔ اس کی روشنی میں، حضور نبی اکرمؐ نے

ایسا نظام متشکل فرمایا جس میں (۱) کوئی فرد کسی دوسرے فرد کا محکوم نہیں تھا ــــ اس میں تمام افراد، قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرتے تھے۔ (۲) کوئی فرد کسی دوسرے فرد کا محتاج نہیں تھا۔ رزق کے سرچشمے ہر ایک کے لئے یکساں طور پر کھلے تھے، کسی کی ذاتی ملکیت میں نہیں تھے۔ (۳) اس میں مذہبی پیشوائیت کا وجود ختم کر دیا گیا تھا۔ اور (۴) انسانی عقل و فکر پر وحی کی مستقل اقدار کے سوا کوئی پابندی نہیں تھی۔ اس سے انسانی فکر کو نشو و نما کے پورے پورے مواقع حاصل ہو گئے۔ آسمان کی آنکھ نے، صفحۂ ارض پر اس سے زیادہ انسانیت ساز دور اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا جس میں کیفیت یہ تھی کہ :-

دین کا نظام

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے تھے
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ، مہ کامل نہ بن جائے

یہ نظام تھوڑی دور چلا کہ استحصالی قوتوں (FORCES OF EXPLOITATION) نے پھر سر اُبھارا اور رفتہ رفتہ دین کی جگہ مذہب نے لے لی۔ میں اس وقت، اس تاریخی تحقیق کی طرف نہیں جانا چاہتا کہ اس تبدیلی کے اسباب و علل کیا تھے، یہ بجائے خویش ایک مستقل موضوع ہے۔ اور اگر میں نے اسے، اس مقام پر ضمناً چھیڑا، تو نہ صرف یہ کہ میں اپنے موضوع سے دور نکل جاؤں گا بلکہ قلتِ وقت کی بنا پر دونوں موضوع تشنہ رہ جائیں گے[1]۔

دین کی جگہ مذہب

بہرحال، سلب و نہب کی قوتیں پھر اُبھریں اور دینیت کے خلاف نبرد آزما ہو گئیں۔ ان کے پیشِ نظر اوّلین مقصد یہ تھا کہ عقل و فکر کی شمعیں گل کر دی جائیں۔ سمجھنے سوچنے کی صلاحیتیں مفلوج کر دی جائیں۔ اس کے لئے کیا کچھ کیا گیا، یہ بھی تاریخی تفصیل ہے جس میں میں اس وقت نہیں جانا چاہتا۔ اس وقت، میں صرف اتنا اشارہ کر کے آگے بڑھ جانا چاہتا ہوں کہ وہ جسے ہماری تاریخ میں، اشاعرہ اور معتزلہ کی کشمکش کا یوں ذکر کر کے آگے بڑھایا جاتا ہے۔ گویا وہ دو فرقوں کے عقائد کی آویزش تھی، وہ درحقیقت مذہب اور دین کی وہی کشمکش تھی جس کی طرف میں نے ابھی ابھی اشارہ کیا ہے۔ مذہب کے پاس دلیل و برہان تو ہوتی نہیں۔ اس کا سب سے خطرناک حربہ لیبل تراشی ہوتا ہے۔ وہ ایک لیبل وضع کرتا ہے اور مسلسل پروپیگنڈہ سے اسے اس قدر گھناؤنا اور نفرت انگیز بنا دیتا ہے کہ وہ جس پر اسے چسپاں کر دے، عوام اس کے خلاف امنڈ پڑتے ہیں۔ مذہب کی طرف سے اس قسم کی لیبل تراشیوں نے کس قدر تباہیاں مچائی ہیں، اس کے لئے تاریخ میں زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں۔ تین چار صدیاں پہلے، یورپ کی اُس تاریخ کا سامنے لانا کافی ہو گا جس میں مذہب اور عقلیت (RATIONALISM) کی معرکہ آرائیاں

---

[1] پرویز صاحب نے اسے اپنی معرکہ آرا تصنیف "شاہکارِ رسالت"، عمر فاروق رضی اللہ عنہ" کے آخری باب میں بڑی تفصیل سے واضح کر دیا ہے۔ (طلوعِ اسلام)

انسانیت کے خون سے لکھی ملتی ہیں۔ گوئٹے نے کہا ہے کہ "سب سے وحشت انگیز منظر وہ ہوتا ہے جب جہالت عملاً میدان میں آجائے"۔ مذہب کی علم و عقل کے خلاف جنگ اسی قسم کے وحشت و بربریت کے لرزہ انگیز مناظر پیش کرتی ہے، خواہ وہ کسی زمانے میں لڑی گئی ہو، اور فریق مخالف کوئی سی قوم اور کوئی سا مذہب بھی کیوں نہ ہو۔ ہماری تاریخ میں بھی، عقل و فکر اور علم و بصیرت کے چراغ گل کرنے کے لئے اسی قسم کے جھکڑ چلے۔ اس میں افراد کے ساتھ کیا ہوا، اسے چھوڑیئے، انسانیت کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ ان لوگوں کی کتابوں کا ایک ایک ورق تلف کر دیا گیا۔ جب اس بحران میں ذرا سکون ہوا، تو رہی سہی

تصوّف اور عقل

کسر تصوّف کی عرفانی سیلوں نے پوری کر دی۔ تاریخ فلسفہ سے واقف حضرات اس حقیقت سے بے خبر نہیں کہ تصوّف (خواہ وہ کسی نام سے موسوم اور کسی پیکر میں جلوہ فرما ہو) درحقیقت افلاطون کے اس نظریہ کی صدائے بازگشت ہے جس کی رُو سے اس نے کہا تھا کہ حواس کے ذریعے حاصل شدہ علم، قطعاً قابلِ اعتماد نہیں ہوتا۔ قابلِ اعتماد وہی علم ہے جو باطنی طور پر حاصل ہو۔ اس طرح مذہب اور تصوّف، دونوں نے مل کر، علم و عقل کے چراغ گل کر دیئے اور اس کا نام 'دین کی خدمت' رکھا۔ لاک نے کہا تھا کہ جو لوگ وحی کا چراغ روشن کرنے کے لئے عقل کے دِیئے بجھا دیتے ہیں وہ درحقیقت عقل اور وحی دونوں کے چراغ گل کر دیتے ہیں۔ ہماری تاریخ اس حقیقت کی نمایاں مثال ہے۔ یہاں عقل و فکر کے چراغ گل کرنے کے لئے جو کوششیں ہوئیں، ان سے یہ چراغ تو گل ہوئے ہی تھے، ان کے ساتھ ہی قرآن جیسی قندیلِ جہاں تاب بھی ان کی توہم پرستیوں اور افسانہ طرازیوں کے فانوسوں میں اس طرح چھپی کہ اس کا صرف نام زبانوں پر باقی رہ گیا۔

اور یہ سب کچھ شخصی حکومتوں کے بل بوتے پر ہوا، کیونکہ شخصی حکومتیں پنپتی ہی اس صورت میں ہیں جب لوگوں کے سمجھنے سوچنے کی صلاحیتوں کو سلب کر لیا جائے۔ اس کا کامیاب ترین طریق یہ ہے کہ معاشرہ پر مسلسل خوف طاری رکھا جائے۔ شخصی حکومتیں قائم ہی خوف کے سہارے رہتی ہیں۔

—(۰)—

میں ابھی ابھی، ان معرکہ آرائیوں کا ذکر کر رہا تھا جو گزشتہ چند صدیوں میں، یورپ میں عقل اور مذہب کے مابین ظہور میں آئیں۔ اس کشمکش میں، بظاہر ایسا نظر آتا ہے جیسے عقل پرستی کی تحریک کامیاب ہوئی اور مذہب کو گرجوں کی پناہ گاہوں میں دبک کر بیٹھ جانا پڑا۔ یہ ٹھیک ہے کہ عیسائیت کا وہاں یہی حشر ہوا۔ لیکن جیسا کہ میں نے شروع میں کہا ہے، مذہب، صرف مزعومہ "خدا پرستی" کا نام نہیں۔ مذہب ہر اس تحریک کو کہتے ہیں جو علم و عقل کے چراغ گل کرنے کے لئے اٹھے۔ اس نقطۂ نگاہ سے دیکھئے تو آپ کو نظر آئے گا کہ مذہب بڑا سخت جان واقعہ ہوا ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ ابلیس کو قیامت تک کے لئے زندہ رہنے کی مہلت دے دی گئی ہے تو اس سے یہی مراد ہے۔ چنانچہ ہوتا یہ ہے کہ مذہب کے کسی ایک پیکر کو شکست ہوتی ہے تو وہ کسی دوسرے پیکر میں نمودار ہو جاتا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

اگرچہ پیر ہے آدمؑ جواں ہیں لات و منات
بدل کے بھیس زمانے میں پھر سے آتے ہیں

یورپ میں عیسائیت کو شکست ہوئی تو مذہب ایک اور لبادہ اوڑھ کر مقابلہ میں آگیا۔ اس کے اس

عوامی تحریک

جدید لبادہ کا نام، عوامی تحریک یا (MASS MOVEMENT) ہے جس طرح دورِ حاضر کے آلاتِ جنگ، سابقہ زمانوں کے آلات کے مقابلہ میں کہیں زیادہ خطرناک اور تباہ کن ہیں، اسی طرح مذہب کا یہ جدید لبادہ، اس کے سابقہ پیکروں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ مہیب اور تخریبی ہے۔ نیشنلزم، نازی ازم، فاشزم، کمیونزم وغیرہ عوامی تحریکات، مذہب کے انہیں جدید لباسوں کا نام ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ انہیں تحریک کہنا غلطی ہے۔ انہیں ہنگامہ، شورش، یا ہیجان (AGITATION) کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔ تحریک تو صرف ایک ہی ہو سکتی ہے۔ یعنی کاروانِ انسانیت کا، عقل اور وحی کی روشنی میں، آہستہ آہستہ، نسیمِ سحری کی خوش خرامیوں کے ساتھ اپنی متعینہ منزل کی طرف بڑھتے چلے جانا ——— تحریک صرف یہی کہلا سکتی ہے۔ باقی سب، جذباتی تلاطم خیزیوں کی وقتی ہنگامہ آرائیاں ہوتی ہیں جو سیلاب کی طرح امنڈتی ہیں اور چند دنوں کی قیامت خیز تخریب کے بعد، وقت کے سمندر میں جا ڈوبتی ہیں ——— یہی وہ ہنگامے ہوتے ہیں، جن کے متعلق اقبالؒ نے کہا ہے کہ ؎

اس سیلِ سبک سیر و زمیں گیر کے آگے!
عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک

ایک تو یورپ کی یہ تحریکیں (یعنی مشتعل اور بیباک جذبات کے طوفانوں پر مبنی شورشیں) بڑی ہمہ گیر تھیں۔ دوسرے اس دور میں رسل و رسائل کی فراوانی ہے۔ اس کی وجہ سے، دنیا کا کوئی گوشہ بھی ان کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکا۔ جب ان کے اثر و نفوذ کی عالمگیریت کی یہ کیفیت تھی تو ظاہر ہے کہ ہندوستان کے مسلمان اس سے کیسے غیر متأثر رہتے ——— اور اصل تو یہ ہے کہ مسلمان اس قسم کی جذباتی تحریکوں کی زد میں سب سے پہلے آنے والی قوم تھی۔ ان کے ہاں صدیوں سے مذہب، یعنی عقل و فکر کے خلاف، جذبات پرستی کا دور دورہ تھا۔ یہ تو وہ "بھک سے اڑنے والا" مادہ (EXPLOSIVE) تھا جسے فتیلہ

ہندی مسلمانوں کی زندگی

دکھانے کی دیر تھی کہ وہ شعلۂ جوالہ بن جاتا۔ آپ ہندی مسلمانوں کی سیاسی زندگی پر طائرانہ نگاہ ڈالیے۔ اگر آپ اس مطالعہ کی ابتدا جنگِ بلقان اور طرابلس سے کر کے ۱۹۴۷ء تک اس کے ساتھ ساتھ چلے آئیں گے تو آپ دیکھیں گے کہ یہ ایک قوم نہیں تھی، آتش سیال کا طوفانی دریا تھی جو ذرا سے اشتعال پر یوں بھڑک اٹھتی تھی کہ سارا ماحول اس کی لپیٹ میں آجاتا تھا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اس کی شعلہ فشانیاں ٹھنڈی پڑ جاتی تھیں اور دیکھنے والی آنکھیں دیکھتی تھیں کہ آتش کی ان شرر باریوں سے اس کے ماحول میں تو کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی لیکن یہ خود راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئی۔ کچھ عرصہ کے بعد، یہی راکھ کا ڈھیر پھر ایک جھکڑ بن کر اٹھتا اور ساری فضا کو طوفان آمیز کر دیتا۔ اس طوفانِ بلاخیز کی برق رفتاریوں سے یوں نظر آتا جیسے وہ اس جہانِ ناساز گار کے محکم ترین قلعوں کی بنیادوں تک کو ہلا کر، انہیں خس و خاشاک طرح نذرِ باد کر دیں گی لیکن تھوڑی دیر کے بعد معلوم ہو جاتا کہ یہ طوفان انگیزی تو بس بگولے کا رقص تھا جو اپنے ہی گرد گھوما اور خود ہی تھک کر

خاموش ہو گیا۔ لیکن اس کے بعد اس کی یہ خاموشی، وہ سکوت ثابت ہوتی جو سمندر میں تازہ تلاطم خیزیوں کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ اس کے بحرِ بے کراں سے بلا انگیز موجیں اٹھتیں اور یوں محسوس ہوتا گویا اس جہان پیر کی موت قریب آ گئی ہے اور اس سیلِ بے پناہ کے سامنے اس کی حیثیت حباب سے زیادہ کچھ نہیں لیکن تھوڑی دیر کے بعد، یہ مضطرب و بے قرار موجیں باہمدگر ٹکرا کر غرقِ دریا ہو جاتیں اور سطحِ آب پر ان کا نقش تک دکھائی نہ دیتا۔ اس قوم کی یہ سیمابی کیفیت اس لئے تھی کہ صدیوں کی مقلدانہ مذہب پرستی اور مستبدانہ ملوکیت سے اس کی عقل و فکر کی صلاحیتیں مشل ہو چکی تھیں۔ اور یہ ہمہ تن جذبات بن کر رہ گئی تھی۔ سرسیّد نے ——— زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا؟ ——— تاریکیوں کے اس ہولناک ویرانے میں فکر کی کچھ شمعیں روشن کرنے کی کوشش کی، لیکن مذہب پرستی کے جھکڑوں نے انہیں چراغِ تہِ داماں بنا دیا ——— اقبالؒ نے جب اس قوم کی ان بے مقصد ہنگامہ آرائیوں اور بلا تعیینِ منزل صحرا نوردیوں پر نگاہ ڈالی تو اس کے دل درد مند سے ایک ہوک اٹھی اور اس نے ۱۹۳۰ء میں، الٰہ آباد کے مقام پر، اپنے

اقبالؒ کا مقام

مشہور خطبۂ صدارت میں، اس آہوئے رم خوردہ کے لئے منزل کا تعین کیا اور قوم کو، اس پر، متانت اور سنجیدگی سے غور کرنے کی دعوت دی۔ لیکن قوم، جذبات کے ہجوم میں اس قدر کھوئی ہوئی تھی کہ کسی نے اس رازدانِ راہِ حیات کی اس صدائے رحیل کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا، اور اسے ایک شاعر کا تخیل اور دلوانے کا خواب کہہ کر، حوالۂ طنز و مزاح کر دیا اور خود پھر انہی ہنگامہ آرائیوں میں منہمک ہو گئی۔ ۱۹۳۲ء میں، اقبالؒ کو آل انڈیا مسلم کانفرنس کے سالانہ اجلاس (منعقدہ لاہور) کا صدر منتخب کیا گیا تو انہوں نے اپنے خطبۂ صدارت کے آغاز میں، قوم کی اس ہنگامہ خیز جذباتیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ ملک کی یہ حالت ہو چکی ہے کہ ایک طرف سے ہمارے کان میں یہ آواز آتی ہے کہ

> اگر ان حالات میں، ہمارے لیڈروں نے، قوم کے لئے کوئی متعین راہِ عمل اختیار نہ کی تو اس وقت دوسروں کی نقالی سے جو کچھ کیا جا رہا ہے، وہ رنگ لا کر رہے گا جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ قوم کا نوجوان طبقہ حوادثِ زمانہ کے سیلِ بے پناہ میں بلا سوچے سمجھے کود پڑے گا۔

تو دوسری طرف سے، ایک نوجوان انتہائے جوش و خروش میں، یہ کہتا ہوا آگے بڑھتا ہے کہ

> عمل کے لئے کسی متعین راستے اور سوچے سمجھے منصوبے کی ضرورت نہیں۔ یہ سبق درسگاہوں کی منطق میں نہیں پڑھایا جا سکتا۔ یہ جذبہ دل کی گہرائیوں سے ابھر کر فضا میں پھیل جاتا ہے تو اپنی منطق آپ مرتب کر لیتا ہے۔

اس کے بعد حضرت علّامہ نے فرمایا کہ

> اس شورش انگیزیوں میں آپ نے اس اجتماع کی صدارت کے لئے ایک مفکر کا انتخاب کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ نے ایسا اس لئے کیا ہے کہ آپ کو اس حقیقت کا احساس ہو گیا ہے کہ ایسے وقت میں قوم کو ایک مفکر کی ضرورت ہے ——— اور یہ حقیقت بھی ہے کہ جس قوم میں فکری صلاحیت

نہیں رہتی، وہ قوم تباہ ہو جاتی ہے۔

ان کے الفاظ، جو میرے خیال میں، آج پاکستان کے ہر در و دیوار پہ، تابندہ حروف میں لکھ دینے چاہئیں یہ تھے کہ (WHERE THERE IS NO VISION PEOPLE PERISH) اقبالؒ کی یہ آواز بظاہر قوم کی ہنگامہ آرائیوں کے نقار خانہ میں گم ہو کر رہ گئی، لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ (NO TRUE VOICE IS EVER LOST) حق کی آواز کبھی صدا بصحرا ثابت نہیں ہوتی ——— تو ایک ایسا کان بھی تھا جس نے اسے، ان ہنگاموں سے دور بیٹھے، سنا اور اپنے صدفِ قلب میں محفوظ رکھ لیا۔ یہ تھا قائدِ اعظمؒ محمد علی جناح ——— وہ محمد علی جناحؒ جو فکر و تدبر کا مجسمہ، متانت و سنجیدگی کا پیکر، صداقت و دیانت کا فشردہ، اقبالؒ کی اس مقدس دعا کی حسین آیت تھا جس میں اس نے کہا تھا کہ ؎

قائدِ اعظمؒ

سازی اگر حریفِ یم بیکراں مرا
با اضطرابِ موج، سکونِ گہر بدہ

ہماری ہزار سالہ تاریخ میں یہ پہلی سیاسی تحریک تھی جس میں ہنگامہ آرائی اور شورش انگیزی کا شائبہ تک نہ تھا۔ جو قرآنی فکر کی روشنی میں، سکوتِ دریا میں بطِ کی سی خاموشی کے ساتھ، جانبِ ساحل رواں دواں چلی جا رہی تھی ——— مانند کہکشاں بگریبانِ مرغزار ——— اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اس سے، دس سال کی قلیل ترین مدت میں، ایک قطرۂ خون بہائے بغیر ——— حتیٰ کہ کسی کو ایک گالی دیئے بغیر ——— پاکستان جیسی وسیع و عریض مملکت حاصل کر لی گئی۔ اور اس طرح ثابت کر کے دکھا دیا کہ قوموں کی تعمیر، فکر سے ہوتی ہے ہنگاموں سے نہیں۔ اور اس قسم کی فکری تحریکیں ان قائدین کے ہاتھوں پروان چڑھتی ہیں جن کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ؎

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز!
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے

——— (۰) ———

اس طرح یہ فکری تحریک کامیاب ہوئی۔ لیکن جس طرح یورپ میں، مذہب نے اپنی شکست خوردگی کے بعد، عوامی تحریکوں کا پیکر اختیار کیا تھا، بدقسمتی سے ہمارے ساتھ بھی یہی ہوا۔ تشکیلِ پاکستان کے ساتھ ہی، وہ مذہب، جو تحریکِ پاکستان کے دوران کونوں کھدروں میں چھپ گیا تھا، پاکستان میں، ایک منظم عوامی تحریک کی شکل میں نمودار ہوا، اور ملک کی فضا کو آندھیوں اور جھکڑوں کی آماجگاہ بنائے چلا گیا۔

——— (۰) ———

قبل اس کے کہ میں آگے بڑھوں، ضروری سمجھتا ہوں کہ مختصر الفاظ میں یہ عرض کر دوں کہ ایسی تحریکیں کن عناصر سے ترکیب پاتی ہیں۔ ان کی خصوصیات اور لوازمات کیا ہوتے ہیں۔ وہ کس قسم کے

عوامی تحریک کے عناصر

لوگوں پر مشتمل ہوتی ہیں اور انہیں کامیاب بنانے کے کیا کیا طریق اختیار کئے جاتے ہیں۔ یہ ہمارے پیشِ نظر موضوع کا بڑا اہم اور بنیادی گوشہ ہے۔ اور خصوصی توجہ کا مستحق۔

۱۔ سب سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ عوامی تحریک کے پیشِ نظر کوئی تعمیر مقصد نہیں ہوتا۔ اس کے پیشِ نظر تخریب ہوتی ہے جس کے لئے وہ معاشرہ میں مسلسل خلفشار اور انتشار (CHAOS) پیدا کرتی رہتی ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ عوام کے جذبات کو مشتعل کیا اور مشتعل رکھا جائے اور انہیں عقل و فکر اور غور و تدبر کی طرف آنے نہ دیا جائے۔

۲۔ عوامی تحریک میں وہ عوام شامل ہوتے ہیں جو اپنی موجودہ زندگی سے غیر مطمئن بلکہ بیزار ہوں، اور مستقبل کی طرف سے مایوس۔ اس میں معاشی ناہمواریوں کو بنیادی طور پر دخل ہوتا ہے یوں تو طبقاتی تفریق کا آغاز اس وقت ہو گیا تھا جب ابلیس نے ابنِ آدم کے کان میں "میری اور تیری" کا افسوں پھونکا تھا۔ لیکن جب کسی قوم میں ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ ایک طبقہ دیکھتے ہی دیکھتے کوڑیوں سے کروڑوں کا مالک بن جائے تو (HAVES) اور (HAVE-NOTS) کی تفریق بڑی نمایاں ہو جاتی ہے۔ اس سے نچلا طبقہ اپنی موجودہ حالت سے بے حد غیر مطمئن ہو جاتا ہے۔ عوامی تحریک چلانے والے اس صورتِ حالات سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ان کی ٹیکنیک یہ ہوتی ہے کہ وہ حال (PRESENT) کو مسلسل کوستے رہتے ہیں۔ اس کے ہر گوشے میں کیڑے ڈالتے رہتے ہیں۔ اس کی خرابیوں کو اچھال اچھال کر نہایت مبالغہ آمیز انداز سے سامنے لاتے رہتے اور اس طرح اس کے خلاف عوام کے جذباتِ نفرت کو مشتعل کئے جاتے ہیں۔ مذہب کے نام پر عوامی تحریک کے علمبردار، معاشرہ کی ہر اخلاقی خرابی کا ذمہ دار اوپر کے طبقہ کو قرار دے کر، اس کے خلاف نفرت کے جذبات ابھارتے رہتے ہیں۔ اور عوام کے دل میں یہ یقین راسخ کر دیتے ہیں کہ ان کی مفلسی اور پریشان حالی کی واحد ذمہ دار، اوپر کے طبقہ کی بداعمالیاں ہیں۔ ہم یا عوام اس کے ذمہ دار نہیں۔

۳۔ اس تحریک کے علمبردار، حال کو اس قدر قابلِ نفرت دکھانے کے ساتھ ساتھ، مستقبل کو اس قدر درخشندہ و تابناک دکھاتے ہیں کہ مایوسوں اور محرومیوں کی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ وہ ان کے دلوں میں ناممکن الحصول امیدوں کے جگمگاتے چراغ روشن کر دیتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ اگر ایک دفعہ اقتدار ہمارے ہاتھ میں آ گیا تو تم دیکھو گے کہ تمہاری زندگی کس طرح مسرتوں کے جھولے جھولتی ہے۔ مذہب پرست طبقہ جو ماضی کو اس قدر درخشندہ بنا کر دکھاتا ہے، اس سے بھی یہی مقصد ہوتا ہے کہ اس کے مقابلہ میں حال بے حد گھناؤنا نظر آئے، اور جب وہ عوام سے کہیں کہ جس نظام کی طرف ہم دعوت دیتے ہیں وہ ایک بار پھر سے اُسی قسم کی جنتی زندگی کا نظارہ دکھا دے گا، تو وہ دیوانہ وار لپک کر اس کے پیچھے ہو لیں۔

۴۔ عوام کے دل میں موہوم امیدوں کے چراغ روشن کر کے، مستقبل کے فریبِ تخیل کو زندہ رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ان سے کوئی بات متعین طور پر نہ کہی جائے بلکہ اپنے پروگرام کو مبہم لیکن نہایت دلکش اور جاذب اصطلاحات کے پردوں میں پیش کیا جائے۔ متعین اور واضح پروگرام سامنے رکھنے میں نقص یہ ہوتا ہے کہ متبعین (FOLLOWERS) قدم قدم پر ماپنے لگ جاتے ہیں کہ ہم اس نصب العین کے قریب پہنچتے جا رہے ہیں یا نہیں۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ ایسا نہیں ہو رہا ہے تو وہ بددل ہو جاتے ہیں۔

۵۔ اپنے پروگرام کو مبہم رکھنے کے ساتھ، یہ بھی ضروری ہے کہ عوام سے ہر وقت یہ کہتے رہا جائے کہ ——— وہ آئی، لو وہ آئی، دلِ ناصبور صبح ——— ان سے کہا جائے کہ اب منزل دور نہیں۔ بس تھوڑی سی ہمت اور کرو۔ یہ تھوڑے بہت تعمیری نشانات جو باقی رہ گئے ہیں انہیں جلدی سے مٹا دو۔ اس کے بعد زندگی کا نقشہ بدل جائے گا۔ عوامی تحریک میں (TEMPO) کا برقرار رکھنا نہایت ضروری ہوتا ہے۔ اور یہ اسی صورت قائم رہ سکتا ہے جب اپنے متبعین سے کہا جائے کہ منزل دُور نہیں۔ اس ضمن میں اُس گدھے کی مثال نہایت برجستہ ہے، جس کی گردن میں چھوٹی سی لکڑی باندھ کر اس کے اگلے سرے پر گاجر لٹکا دیتے ہیں۔ اس میں ٹیکنیک یہ ہوتی ہے کہ اس گاجر کو گدھے کی آنکھ سے ذرا ہی دُور رکھا جاتا ہے۔ اگر اسے لمبے ناصلے پر رکھا جائے تو گدھا اس فریب میں نہیں آ سکتا۔ اسی لئے عوام سے کہا جاتا ہے کہ تم اقتدار ہمارے ہاتھ میں دو۔ پھر دیکھو کہ ہم کس طرح اس نظام کو کل ہی واپس لے آتے ہیں جسے دیکھنے کو تمہاری آنکھیں ترستی ہیں۔

۶۔ عوامی تحریک کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ ان لوگوں کے دل میں یہ خیال راسخ کر دیا جائے کہ حق و صداقت کی حامل صرف ان کی جماعت ہے ——— ان کی تحریک دنیا بھر کی خوبیوں کی واحد مالک ہے۔ یہ خوبیاں کہیں اور نہیں مل سکتیں۔

۷۔ عوامی تحریک میں وہ لوگ کشاں کشاں شامل ہو جاتے ہیں جن کے اپنے اندر کوئی خاص خوبی نہیں ہوتی۔ اس جماعت میں شامل ہونے کے بعد، وہ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ جتنی خوبیاں ان کی پارٹی میں بتائی جاتی ہیں، وہ سب ان کے اپنے اندر موجود ہیں۔ اس طرح ان کا وہ نفسیاتی خلا پُر ہو جاتا ہے جو خوبیوں کے فقدان کی وجہ سے ان کے اندر پیدا ہو گیا تھا اور جس کی وجہ سے وہ مختلف قسم کی نفسیاتی پیچیدگیوں (COMPLEXES) کا شکار ہو رہے تھے۔ جس طرح ایک شخص پانی میں غوطہ زن ہو کر باہر کی دنیا سے بے خبر ہو جاتا ہے، اسی طرح یہ لوگ، اپنی پارٹی کے بحرِ ذخار میں ڈوب کر، دنیا و مافیہا سے نہ صرف بے خبر ہو جاتے ہیں بلکہ ان کی طرف سے اپنے آپ کو مستغنی سمجھنے لگ جاتے ہیں۔

۸۔ عوامی تحریک میں وہ لوگ بھی شامل ہو جاتے ہیں جو عام معاشرہ میں فٹ نہ ہو سکنے کی وجہ سے اپنے آپ

کو تنہا محسوس کرتے ہیں۔ مثلاً سرکاری ملازم عام طور پر ساری عمر معاشرہ سے الگ تھلگ رہ کر گویا تھرماس (THERMOS) میں زندگی بسر کرتے ہیں اور ریٹائرمنٹ کے بعد وہ اپنے آپ کو ایک لق و دق صحرا میں تنہا پاتے ہیں۔ اگر ان میں کوئی ایسے جوہر نہیں جن کی وجہ سے معاشرہ انہیں اپنا لے، تو وہ اپنی تنہائی دُور کرنے کے لئے عوامی تحریکوں میں شامل ہو جاتے ہیں اور یوں سمجھ لیتے ہیں کہ ــــ عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا ــــ!

۹۔ عوامی تحریک کی کامیابی کے لئے یہ امر لابُدی ہے کہ عوام کو مسلسل مصروفِ حرکت رکھا جائے۔ ان کو لگاتار چلاتے رہیں اور اتنی فرصت ہی نہ دیں کہ کسی جگہ کھڑے ہو کر سوچ سکیں کہ ہم کیا کر رہے ہیں اور ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہنگامے برپا کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی عذر تراش لیا جائے۔ اس طرح مسلسل شور و شغب میں مصروف رہنے سے، عوام کی سوچنے سمجھنے کی رہی سہی صلاحیتیں بھی مفقود ہو جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو شخص عوامی تحریک کے نشہ کا خوگر ہو جائے وہ کسی فکری تحریک کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ اگر وہ کسی ایک عوامی تحریک سے الگ ہو گا تو کسی دوسری عوامی تحریک ہی میں شامل ہو گا۔ چونکہ اسے سکھایا ہی یہ گیا تھا کہ عمل نام ہے ہنگامہ آرائی اور غوغہ ثنائی کا، اس لئے وہ فکری تحریک کو بے عملوں کی جماعت قرار دیتا ہے اور اس کی طرف رُخ نہیں کرتا۔

۱۰۔ مسلسل ہنگامہ آرائیوں سے عوام کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو شل اور ان کے دل میں یہ خیال راسخ کر دینے سے کہ حق و صداقت کی اجارہ دار صرف ہماری پارٹی ہے، ان میں وہ اندھی عقیدت پیدا کر دی جاتی ہے جسے (جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے) انگریزی زبان میں (FAITH) کہتے ہیں۔ (FAITH) کی وضاحت برگسان نے بڑے جامع انداز میں کی ہے، جب کہا ہے کہ "(FAITH) یہ نہیں کہ اپنے متبعین کو دکھا دیا جائے کہ ہم پہاڑوں کو چلا دیتے ہیں.... (FAITH) یہ ہے کہ ایسا سحر پھونک دیا جائے کہ انہیں چلتے ہوئے پہاڑ بھی دکھائی نہ دیں۔ عوامی تحریک کے لیڈر کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے متبعین کی نگاہوں کو اس درجہ مسحور کر دے کہ جو حقائق دوسروں کو یونہی نظر آ جائیں، ان کے متبعین لاکھ سمجھانے اور دکھانے پر بھی انہیں تسلیم نہ کریں۔

یہ تو رہے، عوامی تحریک کے لزوم و خصائص۔ جہاں تک اس تحریک کے لیڈر کا تعلق ہے، اس کے اندر بھی چند ایک خصوصیات کا ہونا ضروری ہے۔ مثلاً:-

عوامی تحریک کے لیڈر

۱۔ وہ اصول پرستی کی جگہ حکمتِ عملی کو اپنا مسلک قرار دے۔ یعنی اپنے مقاصد کے حصول کے لئے جس مصلحت کا تقاضا ہو، بلا جھجک ویسا کر گزرے خواہ اصولوں کا تقاضا کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے متبعین کو یہ باور کرا دے کہ اس میں کوئی اصول شکنی نہیں ہو گی۔

۲۔ اسے اس کا کبھی احساس نہ ہو کہ میں نے کل کیا کہا تھا اور آج کیا کہہ رہا ہوں۔ اس "کہہ مکرنے" کی روش کے متعلق وہ اپنے متبعین کو یہ کہہ کر مطمئن کرا دے کہ جنگ میں ہر قسم کا حربہ جائز ہوتا ہے۔

۳۔ وہ سرکشی اور قانون شکنی میں لذت محسوس کرے اور اپنے مخالفین کو ذلیل اور حقیر کر کے خوش ہو، خواہ اس کے لئے اسے دوسروں کے خلاف کیسے ہی جھوٹے الزامات کیوں نہ تراشنے پڑیں —— اس طرح دوسروں کو ذلیل کرنا اس کے متبعین کے نزدیک بھی سب سے بڑا احسنِ عمل قرار پائے گا۔ اور وہ اسے اپنی بہت بڑی کامیابی سمجھیں گے۔

۴۔ اس کے لئے ایسا ضدی ہونا ضروری ہے کہ وہ نہ اپنی کسی غلطی کا اعتراف کرے، نہ کسی دوسرے کی بات مانے۔ وہ اپنے آپ کو ہمہ دان اور محیط کل سمجھے۔

۵۔ اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی تحریک کی قیادت کو اپنی ذات تک محدود، اور اس طرح اسے (ONE MAN SHOW) بنائے رکھے۔ اس لئے وہ اپنی تحریک میں ایسے لوگوں کو، کبھی بار نہ پانے دے جن کے متعلق اسے خطرہ ہو کہ وہ کل کو اس کے ہمدوش ہو جائیں گے۔

میں نے شروع میں کہا تھا کہ عوامی تحریک کی بنیاد، طبقاتی تفاوت کی شدتِ احساس پر ہوتی ہے۔ اس تفریق کو کم اور رفتہ رفتہ ختم کرنے کا فکری اور تعمیری طریق یہ ہے کہ نچلے طبقے کی سطح کو اس قدر بلند کیا جائے کہ اوپر اور نیچے کی تفریق باقی نہ رہے۔ قرآن کریم نے جنت کی زندگی کا جو نقشہ پیش کیا ہے اس میں، طبقاتی تفاوت کو اسی طرح مٹایا گیا ہے۔ اس میں محلات کو گرا کر جھونپڑیوں میں تبدیل نہیں کیا گیا۔ اس میں جھونپڑیوں کو اُبھار کر محلات کے برابر لایا گیا ہے۔ لیکن عوامی تحریک میں مشتعل ہجوم ہر تعمیر کو گرا کر زمین کے ہموار کر دیتا ہے۔ اور اس طرح خوش ہو جاتا ہے کہ ہم نے مساوات پیدا کر دی ہے۔ حالانکہ یہ وہ مساوات ہے جس کا مکمل ترین نمونہ قبرستان میں ملتا ہے یا گھٹا ٹوپ اندھیرے میں —— اندھیرے میں نشیب و فراز بالکل نظر نہیں آتے۔ سب تاریکی کی چادر میں گم ہو جاتے ہیں۔

یہ ہیں وہ عناصر جن سے عوامی تحریک ترتیب پاتی ہے۔ اور یہ ہیں وہ محرکات جن کے بل بوتے پر وہ زندہ رہتی ہے۔ یعنی یہ کہ عقل و فکر کے چراغوں کو گُل کر کے، عوام کے جذبات کو مشتعل کیا اور مضطرب رکھا جائے اور معاشرہ میں مسلسل خلفشار و انتشار (CHAOS) برپا کیا جائے اور ایسا کرنے کو خدائی فریضہ قرار دیا جائے۔

معاشرہ میں اس اضطرابِ پیہم اور خلفشارِ مسلسل سے وہ لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں جن کے دل میں ہوسِ اقتدار چٹکیاں لے رہی ہو۔ بلکہ اصل یہ ہے کہ وہ بالواسطہ انتشار کی اس آگ کو مشتعل رکھنے کا ایندھن فراہم کرتے رہتے ہیں۔ اور جب وہ برسرِ اقتدار آ جاتے ہیں تو ان کے سامنے بھی کوئی تعمیری مقصد نہیں ہوتا مقصد ان کا صرف اپنی کرسی کو قائم کرنا اور استوار رکھنا ہوتا ہے، خواہ کسی طریق سے ہو۔

—— (۰) ——

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ پاکستان کے وجود میں آنے کے ساتھ ہی، یہاں مذہب کے نام پر، عوامی تحریک کی طرح ڈالی دی گئی۔ ملک میں بدقسمتی سے، غلط نظامِ زندگی اور اربابِ نظم و نسق کی بدعنوانیوں

کوئی تعمیری کام نہیں

سے، جوں جوں عوام کی حالت خراب سے خراب تر ہوتی گئی، یہ تحریک بھی بڑھتی چلی گئی، اور اس کے ساتھ ہی اس کے تخریبی نتائج بھی ابھرتے چلے گئے۔ آپ اس تحریک کی تاریخ پر غور کیجئے۔ آپ کو اس میں کوئی تعمیری کام دکھائی نہیں دے گا۔ اس کے برعکس، اس حقیقت سے ہر شخص آگاہ ہے کہ انہوں نے اس تمام عرصہ میں ایک دن بھی، ملک کو چین سے نہیں بیٹھنے دیا۔ یہ مسلسل (CHAOS CREATE) کرتے رہے۔

(۰)

تاریخ اس حقیقت کی شہادت دیتی ہے کہ جو تحریکیں، عقل و فکر کے چراغ بجھانے کے لئے جھکڑ بن کر اٹھیں، انہوں نے انسانی تہذیب و تمدن کی عمارات کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ اس سیلابِ بے پناہ کا مقابلہ وہ سلطنتیں بھی نہ کر سکیں جو صدیوں سے پہاڑوں کی طرح محکم چلی آ رہی تھیں۔ جب ۱۹۶۸-۶۹ء کے ہنگامے زوروں پر تھے تو میں نے، ان کے آتش برداروں کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ آپ قوم کو قانون شکنی کا خوگر نہ بنائیں۔ انہیں قانون کا احترام سکھائیں۔ قانون شکنی، دو دھاری تلوار ہوتی ہے۔ جب بیگانے اس کا

قوم کو قانون کا احترام سکھائیں

شکار ہو چکتے ہیں تو پھر یہ اپنوں کے خلاف اٹھنی شروع ہو جاتی ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ جب ۱۹۴۲ء میں مسٹر گاندھی نے (QUIT INDIA) کی تحریک شروع کی، اور قوم کو قانون شکنی کے لئے بے باک چھوڑ دیا، تو اس نے قائدِ اعظمؒ کو دعوت دی تھی کہ جب، انگریز کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کا ہمارا اور آپ کا مقصد ایک ہے تو آپ بھی اس تحریک میں شامل ہو جائیے یا کم از کم اس کی تائید کیجئے۔ اس کے جواب میں قائدِ اعظمؒ نے فرمایا تھا کہ گاندھی جی! قوم کو قانون کا احترام.... سکھائیے۔ قانون شکنی کا سبق نہ پڑھائیے۔ ایک دفعہ قوم کو اس کی عادت پڑ گئی تو آج جس سیلاب کا رُخ، انگریز کی طرف ہے کل کو اُس کا رُخ خود آپ کی سمت ہو جائے گا۔ اس وقت اس کے سامنے بند باندھنا آپ کے بھی بس میں نہیں رہے گا۔ یہی کچھ میں نے اپنے ہاں کے ان لیڈروں کی خدمت میں عرض کیا تھا جو اس وقت قوم کو قانون شکنی کے لئے ابھار رہے اور اس کے اس عفریتی رقصِ آتشیں پر جشنِ مسرت منا رہے تھے۔ میں نے کہا تھا کہ اللہ دین کے چراغ کے اس جن کو بوتل سے نہ نکالئے۔ یہ ایک دفعہ باہر نکل آیا تو اسے دوبارہ بوتل میں بند کرنا خود الہ دین کے بس کی بات بھی نہیں ہوگی.... لیکن قوت کے نشہ کی مدہوشی اس قسم کے مشوروں کو کب درخورِ اعتنا سمجھتی ہے۔ انہوں نے قانون شکنی کی جی بھر کر داد دی۔ ان عناصر کو قوم کا ہیرو قرار دیا۔ اب حالت یہ ہے کہ جب وہی، قانون شکنی کے خوگر عناصر، ان کے خلاف اٹھتے ہیں تو یہ چیخنے لگ جاتے اور فریاد کرتے ہیں کہ انہیں روکئے۔ لیکن اب انہیں روک کون سکتا ہے؟

جو آگ لگائی تھی تم نے اس کو تو بجھایا اشکوں نے
جو اشکوں نے بھڑکائی ہے اس آگ کو ٹھنڈا کون کرے

اور اس کا خمیازہ ساری قوم کو بھگتنا پڑا۔

(٥)

قرآنِ کریم جس دین کو نوعِ انسانی کے لئے باعثِ سربلندی قرار دیتا ہے اس کی رو سے ہر وہ نظام جو انسانیت کی فوز و فلاح کے راستے میں حائل ہو، باطل ہو، فالہٰذا الطیبی ہے۔ جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا تھا، اصولی طور پر وہ اس نظام کو تین شقوں میں تقسیم کرتا ہے ـــــ وہ سیاسی نظام جس میں ایک انسان کسی دوسرے انسان یا انسانوں کے گروہ کے احکام کی اطاعت پر مجبور ہو۔

باطل کے نظام

وہ ملوکیت یا آمریت کی شخصی حکومت ہو یا مغربی جمہوریت، عملاً دونوں میں بعض انسان، دوسرے انسانوں پر حکومت کرتے ہیں۔ اسے عصرِ حاضر کی اصطلاح میں سیکولر ازم بھی کہا جاتا ہے۔ اس نظام کا نمائندہ فرعون تھا۔ دوسرے اندھی عقیدت کا وہ نظام جس میں انسانوں کا ایک گروہ، دوسرے انسانوں کی فکری صلاحیتوں کو مفلوج کرکے ان کے قلب و دماغ پر اپنی حکمرانی مسلط کر دے۔ اسے مذہبی پیشوائیت کا نظام کہا جاتا ہے جس کا نمائندہ ہامان تھا۔ اور تیسرے وہ معاشی نظام جس میں ایک انسان، روٹی کے لئے دوسرے انسان کا محتاج ہو جائے۔ اسے نظامِ سرمایہ داری سے تعبیر کیا جاتا ہے جس کا نمائندہ قارون تھا۔ قرآن کی رُو سے، دین کا نظام قائم نہیں ہو سکتا جب تک باطل کے ان نظامہائے حیات کو مٹایا نہ جائے۔ لیکن وہ انہیں مٹانے کا طریق عوامی تحریک قرار نہیں دیتا جس میں جذبات کو مشتعل کر کے، تخریبی سرگرمیاں اختیار کی جاتی ہیں۔ وہ اس کا طریقہ، فکری تحریک تجویز کرتا ہے جس میں قلب و دماغ کی داخلی تبدیلی سے خارجی احوال و ظروف میں تبدیلی پیدا کی جاتی ہے ـــــ "تبدیلی پیدا کی جاتی ہے"۔

داخلی تبدیلی

قلب و نگاہ کی تبدیلی کا فطری نتیجہ خارجی ماحول کی تبدیلی ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم نے اس بنیادی حقیقت کو ان بصیرت افروز الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ ...... (۱۳/۱۱)

جب تک کوئی قوم اپنی داخلی (نفسیاتی) دنیا میں تبدیلی نہیں پیدا کرتی، خدا اس کے خارجی احوال میں تبدیلی پیدا نہیں کرتا۔

اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

یک منزل رانمی دانی بہ راہ — قیمتِ ہر شے زاندازِ نگاہ!
نوعِ دیگر بیں، جہاں دیگر شود — ایں زمین و آسماں دیگر شود

قرآن کا مقصد، انسانی قلب و نگاہ میں اسی قسم کی تبدیلی پیدا کرنا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں: ؎

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است — ایں کتابے نیست چیزے دیگر است

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود!

نوعِ انسانی کا وہ عظیم ترین انقلاب، جو آج سے چودہ سو سال پہلے حضور نبی اکرمؐ اور آپ کے رفقائے جلیل کے مقدس ہاتھوں سے رونما ہوا تھا اس کے لئے یہی طریق اختیار کیا گیا تھا ـــــ اس مقام پر میں اتنا اور واضح کر دوں کہ قرآن کریم کی رُو سے، کسی مقصد اور اس کے حصول کے طریق میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ (MEANS ARE JUSTIFIED BY THE ENDS ACHIEVED) میکیاولی سیاست کا اصول ہے۔ قرآن کا نہیں۔ قرآن کی رُو سے، غلط راستہ صحیح منزل تک کبھی نہیں پہنچا سکتا۔ اس لئے قرآنی انقلاب میں جہاں صحیح منزل کا تعین حق کے مطابق ہونا چاہیئے، اس کے حصول کا طریق بھی مبنی برحق ہونا چاہیئے۔ اس انقلاب کے لئے جس کی طرف میں نے ابھی ابھی اشارہ کیا ہے حضورؐ نبی اکرمؐ نے اپنی دعوت کا آغاز کیا تو اس وقت (حضورؐ کے سوا) دنیا میں کوئی مسلم نہیں تھا۔ آپؐ نے اس نظام نو کے اصول و اقدار اپنی قوم کے سامنے پیش کئے اور پیش کرتے چلے گئے۔ قوم نے اس دعوت کی مخالفت کی، لیکن ان میں ایسے افراد بھی تھے جنہوں نے اس پر، سکون و اطمینان سے غور و فکر کیا اور اس کے بعد، جب وہ اس کی صداقت کے متعلق، دل اور دماغ کی کامل رضامندی سے مطمئن ہو گئے تو انہوں نے اسے قبول کرنے کا اقرار کیا اور اس طرح اس سوسائٹی کے ممبر بن گئے جس کی طرف حضورؐ دعوت دیتے تھے۔

جو لوگ اس طرح اس سوسائٹی کے ممبر بنتے تھے، ان کی تعلیم و تربیت کا خصوصی انتظام خود نبی اکرمؐ فرماتے تھے۔ قرآن کریم نے جو حضورؐ کی یہ خصوصیت کبریٰ بیان کی ہے کہ: يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ..... تو وہ اسی حقیقت کی وضاحت کرتی ہے۔ یعنی حضورؐ انہیں اس نظام کے قواعد و ضوابط کی تعلیم دیتے تھے۔ اس کی حکمت و غایت سے آگاہ کرتے تھے اور اس کے ساتھ ہی ان کی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کرتے چلے جاتے تھے۔ "صلاحیتوں کی اس نشوونما" سے مراد صرف ذہنی صلاحیتیں نہیں، اس سے مفہوم ان صلاحیتوں کی نشوونما ارتقا بھی ہے جن کی بنیادوں پر انسانی سیرت و کردار کی بلند و بالا عمارت استوار ہوتی ہے۔ اسے انسانی ذات کی نشوونما کہا جاتا ہے۔ اسی سے ابنِ آدم حیوانی سطح سے بلند ہو کر انسانی سطح پر زندگی بسر کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اور یہی چیز جذبۂ محرکہ بنتی ہے اس عظیم ایثار کا جس پر اس نظام کی عمارت استوار ہوتی ہے ـــــ جان مار کر محنت کرو، اور اپنے لئے کم از کم رکھ کر فاضلہ سب دوسرے ضرورت مندوں کے لئے دے دو۔

اس جماعت کے افراد کو مومن کہا جاتا تھا۔ یعنی وہ لوگ:۔

(۱) جنہوں نے سوچ سمجھ اور دیکھ بھال کر، برضا و رغبت، اس نظام کی صداقت کو قبول کیا۔
اور (۲) ان کی تعلیم و تربیت خود رسول اللہؐ نے فرمائی۔ اور اس طرح ان کے قلب و نگاہ میں قرآنی اقدار کے مطابق انقلاب پیدا ہوتا چلا گیا۔

رسول اللہؐ کی مکّی زندگی پوری کی پوری اسی عملِ تزمیل (جماعت سازی) میں بسر ہوگئی اور تیرہ سال کے عرصہ میں جو افراد اس سوسائٹی کے رکن بنے ان کی تعداد چند سو سے زیادہ نہ تھی۔ اگر ہم اپنے اندازوں کے مطابق ماپیں تو یہ پروگرام بڑا سُست خرام دکھائی دے گا۔ آپ غور کیجئے کہ حضورؐ کی عمرِ رسالت صرف تیئس سال تھی اور آپؐ کا عہدِ رسالت قیامت تک کے عرصہ کو محیط تھا۔ اس اعتبار سے حضورؐ کی حیاتِ طیبہ کا ایک ایک سانس صدیوں پر بھاری تھا۔ اس تیئس سال کے گراں بہا عرصہ میں سے تیرہ سال کی مدت ابتدائی عملِ تزمیل میں صرف ہوگئی اور اس کا ماحصل چند سو افراد سے آگے نہ بڑھا۔ اور حضورؐ کی طرف سے یہ سب کچھ نہایت سکون و سکوت کے ساتھ ہوا۔ جو حضرات بنیادی نظریات کی تبلیغ و تعلیم کے مرحلہ کو "بے عملی" سے تعبیر کرتے ہیں، اور عمل کا تصور ان کے ہاں ہنگامہ خیزی اور شورش انگیزی ہوتا ہے، ان کے نزدیک تو حضورؐ کی یہ تیرہ سالہ زندگی "بے عملی" کا دور کہلائے گی!

اس جماعتِ مومنین کی مکّی زندگی ایک اور اہم حقیقت کی بھی پردہ کشا ہے۔ لوٹ مار، جنگ و جدال، فتنہ و فساد، عربوں کی گھٹی میں پڑا تھا، اور اس جماعتِ نو کے افراد انہی عربوں میں سے تھے۔ اس تیرہ سال کے عرصہ میں اس جماعت کے افراد پر ہر قسم کے مظالم ہوئے۔ انہیں ناقابلِ برداشت تکالیف اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن ان میں سے کسی نے نہ کسی قسم کا دنگا فساد کیا، نہ لڑائی جھگڑا۔ نہ کسی کو لوٹا نہ کھسوٹا۔ نہ کہیں پتھراؤ کیا نہ گھیراؤ۔ حتّٰی کہ نہ کہیں جھوٹ بولا نہ کسی کو فریب دیا۔ نہ کسی سے بدمعاملگی کی نہ کسی قسم کی عہد شکنی۔ تکلیفیں برداشت کرتے رہے۔ مصیبتیں اٹھاتے رہے لیکن فریقِ مقابل کے خلاف نہ جھوٹا پراپیگنڈہ کیا، نہ کسی قسم کی غلط بیانی سے کام لیا۔ نہ کوئی سازش کی، نہ زیرِ زمین تحریک چلائی۔ جو کچھ کیا کھلے بندوں کیا۔ جو کچھ کیا علی الاعلان کیا۔ اپنے کام سے کام رکھا اور جب دیکھا کہ مکّہ کے مقابلہ میں مدینہ کی فضا اس نظام کے قیام کے لئے زیادہ سازگار ہے تو نہایت خاموشی سے ہجرت کرکے وہاں چلے گئے اور جاتے وقت بھی نہ کسی کو کسی قسم کا دھوکا دیا نہ خیانت کی۔

مدینہ گئے تو وہاں کسی سے حکومت نہیں چھینی۔ نہ ہی ایسا ہوا کہ کوئی بنی بنائی حکومت کسی نے ان کے حوالے کردی ہو۔ وہاں انہوں نے اپنی مملکت قائم کی —— "مملکت قائم کی" کے الفاظ ذرا وضاحت طلب ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ مملکت قائم کس طرح سے کی گئی تھی۔ اس کے لئے طریق کار کیا اختیار کیا گیا تھا۔ اس سلسلہ میں قرآن پھر ایک اصول بیان کرتا ہے، اور وہ اصول ایسا جامع ہے جس میں تمام تفاصیل خود بخود سمٹ کر آجاتی ہیں۔ سورۃ النور میں ہے: وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ (۲۴/۵۵) یعنی یہ مملکت نہ کسی سے چھین جھپٹ کر لی گئی تھی نہ کسی نے بطورِ بخشائش ہبہ کردی تھی۔ یہ فطری نتیجہ

ؐ رسول اللہؐ کو اسی جہت سے قرآن میں المزمّل کہا گیا ہے۔ یعنی وہ سالارِ کارواں جو رفقائے سفر کے انتخاب میں انتہائی کاوش و احتیاط سے کام لے۔ مزّمل کے یہی معنی ہیں۔

تھی ان کے ایمان اور اعمالِ صالحہ کا ـــــ ایمان ـــــ یعنی اپنے نصب العین کی صداقت پر یقینِ محکم اور اعمالِ صالحہ ـــــ قرآنی اقدار و اصول کے اندر رہتے ہوئے مناسب اقدامات۔

جب یہ جماعت یوں صاحبِ اقتدار ہو گئی تو معاشرہ میں نظامِ اسلامی خود بخود نافذ ہو گیا۔ بالفاظِ دیگر یوں کہئے کہ یہ کاروان، مختلف وادیوں میں سے گذرنے کے بعد، اپنی منزلِ مقصود تک جا پہنچا۔ اس وقت نہ کسی نے یہ سوال اٹھایا کہ مملکت تو مل گئی ہے، اب اس میں کس قسم کا سیاسی نظام قائم کیا جائے۔ نہ یہ تنازعہ پیدا ہوا کہ فلاں قسم کا معاشی نظام اسلامی ہے یا غیر اسلامی ـــــ انہوں نے چلنے سے پہلے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ ہم نے پہنچنا کہاں ہے۔ اس لئے منزل پر پہنچنے کے بعد کسی کے دل میں یہ سوال نہ ابھرا کہ یہ ہماری منزلِ مقصود ہے یا نہیں۔ ان میں سے ہر فرد جو اس سوسائٹی کا ممبر بنا تھا، سب کچھ دیکھ بھال کر، سوچ سمجھ کر ممبر بنا تھا۔ ان میں سے ہر ایک کو معلوم تھا ـــــ اور حتمی اور یقینی طور پر معلوم کہ اس سوسائٹی کا مقصود و منتہیٰ کیا ہے ـــــ اور اس مقصد کے حصول کے لئے ہمارا فریضہ کیا۔ یہ افراد اس سوسائٹی کا ممبر بننے کے بعد، اپنے آپ کو اس مقصد کے حصول کے لئے تیار کرنے اور اس کے اہل بننے میں مصروف رہے۔ جب انہوں نے اپنے اندر اس کی اہلیت پیدا کر لی تو مقصد حاصل ہو گیا یعنی اسلامی نظام قائم ہو گیا۔ اس کے بعد یہ لوگ اس نظام کے استحکام و فروغ اور اندرونی اور بیرونی خطرات سے اس کی حفاظت و مدافعت کے لئے مصروفِ جدّ و جہد رہے۔ یہ ہے وہ طریق جس کے مطابق صدرِ اوّل میں یہ نظام قائم ہوا۔ یعنی اس نظام کے اصول و اقدار کو بہ دلائل و براہین لوگوں کے ذہن اور دل نشین کرانا۔ اور جو اس طرح ان کی صداقت تسلیم کر لیں مناسب تعلیم و تربیت سے، ان کی انسانی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنا۔ اور یہی طریق ہر اس شخص اور اس جماعت کو اختیار کرنا ہو گا جو صحیح اسلامی نظام قائم کرنے کی داعی ہو۔

نوجوانوں کا اضطراب

اس مقام پر ہمارا نوجوان طبقہ (جس کے جذبات کو مسلسل مشتعل کیا جا رہا ہے) تلملا اٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ ملک میں غریبوں پر گوشۂ عافیت تنگ ہو رہا ہے۔ انہیں زندگی کے دن گذارنے مشکل ہو رہے ہیں۔ ان کے پاس کھانے کو روٹی ہے، نہ پہننے کو کپڑا، نہ رہنے کو مکان ہے، نہ علاج کے لئے چار پیسے، ان پر ہر طرف سے مظالم ٹوٹ رہے ہیں۔ ان کے حقوق تلف ہو رہے ہیں۔ ان غریبوں اور ناداروں کو روٹی کپڑے اور انصاف کی آج ضرورت ہے اور آپ اُن سے کہہ رہے ہیں کہ اس وقت تک انتظار کرو جب تک قوم میں نفسیاتی تبدیلی نہ پیدا ہو جائے۔ اور نہیں سمجھتے کہ ـــــ تا تریاق از عراق آوردہ شود، مار گزیدہ مردہ شود۔ ـــــ ؎

آہ کو چاہیئے اِک عمر اثر ہونے تک!
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک؟

مجھے اپنے ان عزیزوں کی بیتابیٔ تمنا کا پورا پورا احساس ہے اور جہاں تک غریبوں کی مشکلات کا تعلق ہے انہیں شاید معلوم نہ ہو کہ رزق کی ان ناہمواریوں کو ملک میں تو آج ابھارا گیا ہے اور میں گذشتہ بیس سال سے مسلسل

اس کے لئے چیخ رہا ہوں۔ لیکن اس کے باوجود، میں ان نوجوانوں سے کہوں گا کہ تپ دق کا علاج راتوں رات نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے وقت درکار ہوتا ہے اور مریض اور تیمارداروں کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اس مدت کو صبر و تحمل سے گزاریں۔ اس قسم کی ایک اور مثال لیجئے ـــــ ایک کسان کے ہاں من بھر گندم بیج کے لئے رکھا ہے اور اس کے بچے بھوک سے بلک رہے ہیں۔ بچوں کی بھوک کا تقاضا ہے کہ وہ اس گندم کو پسوا لائے اور بچوں کو روٹی کھلا دے۔ اس سے بچوں کی دو چار دن کی بھوک کا علاج تو ہو جائے گا لیکن اس کے بعد کیا ہوگا؟ ان کی بھوک کا مستقل علاج یہی ہے کہ بیج کو کھیت میں بو دیا جائے اور فصل پکنے تک کا انتظار کیا جائے اور اس دوران میں بچوں کی روٹی کا کوئی اور انتظام سوچا جائے۔

صحیح انقلاب کے لئے وقت درکار ہوتا ہے اور ہماری ہزار تمناؤں اور آرزوؤں، بیتابیوں اور اضطرابیوں کے باوجود، فطرت اپنے قانون میں کبھی تبدیلی نہیں کرتی۔ جس غالب نے یہ کہا تھا کہ ـــــ کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک ـــــ تو اُسے اس کا بھی احساس تھا کہ ـــــ عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب ـــــ ہماری بیتابیٔ تمنا عشق کی صبر طلبی کے تقاضوں کا بدل نہیں بن سکتی۔ ہمارے یہ نوجوان

چین کی مثال

چین کی مثال پیش کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دیکھئے! انہوں نے چند دنوں میں کتنا بڑا انقلاب برپا کر دیا[1]۔ ان کی بھول یہ ہے کہ وہ اس انقلابی جدّ و جہد کی مدت کو اس دن سے شمار کرتے ہیں جب وہ محسوس طور پر دنیا کے سامنے آیا جس زمانے میں وہ لوگ نہایت خاموشی سے اس کی تیاریوں میں مصروف تھے، وہ ان کی نگاہوں سے اوجھل ہوتا ہے ؎

ایک جلنے کے سوا اور کوئی کیا جانے
حالتیں کتنی گذر جاتی ہیں پروانے پر

چین کے مشہور مجلّہ پیکنگ ریویو کی ۲۰ مارچ ۱۹۷۰ء کی اشاعت میں، انقلابِ چین کے قائد ماؤزے تنگ کا ایک مقالہ شائع ہوا تھا۔ اس میں اس نے لکھا تھا:-

> دانشوروں کا مسئلہ آئیڈیالوجی کا مسئلہ ہے اور آئیڈیالوجی سے متعلق مسائل کو حل کرنے کے لئے جبر و استبداد کے ہتھکنڈے طریقے، نہ صرف یہ کہ مفید نہیں ہوتے بلکہ (تحریک کے لئے) نقصان رساں ہوتے ہیں۔ ہمارے رفقاء کو معلوم ہونا چاہیئے کہ نظریاتی تبدیلی کے لئے بڑے طویل المیعاد صبر آزما اور استقامت طلب پروگرام کی ضرورت ہوتی ہے۔ انہیں یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے (اور نہ ہی ایسی کوشش کرنی چاہیئے) کہ وہ محض چند لیکچروں اور جلسوں سے لوگوں کے نظریات میں تبدیلی پیدا کر دیں گے۔ قوموں کے نظریات صدیوں میں جا کر مرتب ہوتے ہیں اس لئے انہیں راتوں رات بدلا نہیں جا سکتا۔ یہ کام جبر و استبداد سے نہیں ہوگا۔ لوگوں کے قلب و دماغ کو رفتہ رفتہ اس تبدیلی کے لئے آمادہ کرنا ہوگا۔

---

[1] یہ ۱۹۷۰ء میں لکھا گیا تھا۔

آپ سوچیئے کہ جب اس انقلاب کے لئے جسے محض خارجی معاشرہ میں برپا کرنا مقصود ہو، اس قسم کے طویل المیعاد صبر آزما پروگرام کی ضرورت ہوتی ہے تو اس انقلاب کے لئے جس میں غلط معتقدات، نظریات، تصورات، اعمال و افکار کو صحیح نظریات سے بدلنا اور انسانی سیرت و کردار کے ہر گوشے کو ایک جدید قالب میں ڈھالنا مطلوب ہو، کس قدر سکون و ثبات کے ساتھ صبر آزما مراحل میں سے گزرنا ہوگا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ آپ غریبوں اور محتاجوں کی مصیبتوں کو علیٰ حالہٖ رہنے دیں اور ان کی کوئی مدد نہ کریں۔ جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ آپ اپنا نصب العین قرآنی نظام رکھیں جس میں ہر نوع کی غلامی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اس نصب العین تک بتدریج پہنچا جائے گا۔ اس لئے اس کی طرف اس طرح قدم بڑھایئے کہ ملک میں فساد نہ برپا ہونے پائے۔ اور ضرورت مندوں کی مرفہ الحالی کی شکلیں نکلتی چلی جائیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ قوم کے نوجوانوں کے دل میں قانون شکنی اور سرکشی کے جذبات ابھارنے کے بجائے، انہیں قرآنی قوانین کا احترام سکھایا جائے۔ ان میں اخلاقِ حمیدہ کی آرزوؤں کو بیدار کیا جائے، ان میں معاملات کو ٹھنڈے دل سے سوچنے اور حل کرنے کی صلاحیت پیدا کی جائے، اور منتہیٰ، افرادِ قوم کے قلب و دماغ میں صحیح قرآنی تبدیلی، قرار دیا جائے۔ اس تبدیلی کی بنیادی شرط ایمان بالآخرت ہے۔ یعنی اس حقیقت پر کامل یقین کہ انسان کا

ایمان بالآخرۃ

کوئی عمل حتیٰ کہ اس کے دل میں گزرنے والے خیالات تک بھی اپنا نتیجہ پیدا کئے بغیر نہیں رہ سکتے، اور ان نتائج کا خمیازہ ہر انسان کو بھگتنا ہوگا، خواہ وہ اس زندگی میں سامنے آجائیں اور خواہ مرنے کے بعد ——— اس ایمان کے بعد، قرآنی قانون کی اطاعت، یا مستقل اقدار کی پابندی، نہ پولیس کے ڈر سے کی جائے گی، نہ قید و بند کے خوف سے۔ یہ چیزیں اس شخص کے دل کی آواز اور زندگی کا تقاضا بن جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے بتایا ہے کہ جسے اسلامی نظام کہتے ہیں، وہ اس وقت قائم ہوگا جب کیفیت یہ ہو کہ یہ لوگ (اے رسولؐ) اپنے ہر نزاعی معاملہ کے تصفیہ کے لئے تیری طرف رجوع کریں۔ یعنی قانون کو اپنے ہاتھ میں نہ لے لیں، بلکہ ہر معاملہ میں فیصلہ کرنے والی اتھارٹی کی طرف رجوع کریں۔ اور اس کے بعد: ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ہ (۴/۶۵) اور پھر جو فیصلہ تو دے، اس کے سامنے اس طرح سرِ تسلیم خم کریں کہ ان کے دل کی گہرائیوں میں بھی اس کے خلاف کوئی گرانی

اسلامی نظام کے قیام کی شرط

محسوس نہ ہو۔ جب تک معاشرہ میں یہ کیفیت پیدا نہ ہو، آپ کسی نظام کو اسلامی نہیں کہہ سکتے خواہ اس کی شکل و صورت کیسی ہی اسلامی کیوں نہ دکھائی دے۔ اور ظاہر ہے کہ قلب و نگاہ میں ایسی تبدیلی ہنگامہ خیزیوں اور زور آزمائیوں سے پیدا نہیں ہو سکتی۔ یہ صرف فکری تحریک سے پیدا ہو سکتی ہے جس کا مقصد، افرادِ معاشرہ کی قرآنی خطوط پر تعلیم و تربیت ہو۔ میں نے، جیسا کہ متعدد بار عرض کیا ہے، تحریکِ پاکستان میں، اپنی بساط کے مطابق حصہ لیا تو اس لئے کہ میرا ایمان تھا کہ اسلام ایک زندہ نظامِ حیات اسی صورت میں قائم ہو سکتا ہے جب اس کی اپنی آزاد مملکت ہو اور قرآنِ کریم ہر،

غور و تدبر سے یہ حقیقت بھی مجھ پر واضح ہو گئی تھی کہ اپنی آزاد مملکت میں اسلامی نظام اسی صورت میں قائم ہو سکتا ہے جب نونہالانِ ملّت کی تعلیم و تربیت قرآنی خطوط پر کی جائے جس سے اُن کی کیفیت یہ ہو جائے کہ مستقل اقدارِ خداوندی کی پابندی ان کی زندگی کا داخلی تقاضا بن جائے اور اس کے خلاف ان کے دل کی گہرائیوں میں بھی کوئی گرانی محسوس نہ ہو۔ میں نے اس کے لئے طلوعِ اسلام کی فکری تحریک کی بنیاد رکھی جو بتوفیق ایزدی اس بائیس[۱] سال کے عرصہ میں، کامل سکوت و سکون سے اس طرح آگے بڑھتی چلی گئی جس طرح طلوعِ ماہتاب کے ساتھ چاندنی کی حسین چادر، نہایت خاموشی سے، فرشِ صحرا پر بچھتی اور پھیلتی چلی جاتی ہے۔ یا گوئٹے کے "نغمۂ محمدؐ" میں اس آسمانی ندی کی طرح، جسے اقبالؒ نے ان الفاظ سے دو آتشہ کر دیا ہے کہ ؎

بنگر کہ جوئے آب چہ مستانہ می رود
باخود بیگانہ، از ہمہ بیگانہ می رود

اس تحریک نے کبھی کسی ہنگامے میں حصہ نہیں لیا۔ اس نے قوم کو سوچنا سکھایا —— اور قرآنی روشنی میں سوچنا سکھایا۔ پاکستان آنے کے بعد، ہم نے قوم سے کہا کہ ہم جس قسم کے مسلمان بھی ہیں، ہمارا فریضہ یہ ہونا چاہیئے کہ ہم اس خطۂ پاک کو بیرونی خطرات سے محفوظ اور اندرونی خلفشار سے مامون رکھیں۔ اس کے ساتھ ہمیں اپنی آنے والی نسلوں کی تعلیم و تربیت کا ایسا انتظام کرنا چاہیئے جس سے وہ اسلامی زندگی کا پیکر بن کر اُبھریں۔ اس سلسلہ میں، ہم نے پاکستان میں مروّجہ طریق و نصابِ تعلیم میں تبدیلی کی طرف قوم کی توجہ بالعموم، اور اربابِ حل و عقد کی بالخصوص مبذول کرائی —— اور اپنی اس کوشش کو مسلسل جاری رکھا لیکن مجھے انتہائی افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ یہ حضرات اپنے اپنے مقاصد میں منہمک رہے اور جس مسئلہ پر قوم اور پاکستان کے مستقبل کا انحصار تھا اس کی طرف کسی نے توجہ نہ دی۔ ہم آج جس قوم کے ہاتھوں اس قدر نالاں ہیں، یہ قوم مریخ سے نہیں ٹپک پڑی۔ یہ وہی قوم ہے جسے ہم بیس بائیس[۲] سال سے اپنی درس گاہوں —— اسکولوں، کالجوں،

تعلیمی نظام

مکتبوں، دارالعلوموں —— میں تیار کرتے رہے ہیں۔ اس قوم کو بنایا ہم نے خود ہی ایسا ہے اور جب یہ ایسی بن چکی ہے تو ہم اسے موردِ الزام ٹھہراتے ہیں کہ تم ایسی کیوں ہو؟ اور طرفہ تماشا یہ کہ ہم موجودہ قوم کے ہاتھوں نالاں بھی ہیں اور اسی قسم کی قوم تیار کرنے میں مصروف بھی! یعنی ہم اپنی مروّجہ تعلیم کے برگ و بار سے اس قدر ملولِ خاطر بھی ہیں اور اس کے ساتھ ہی اسے علیٰ حالہٖ جاری بھی رکھے ہوئے ہیں۔ اس میں کسی تبدیلی کے لئے تیار نہیں۔

میں نے یہ کچھ سنہ ۱۹۷۰ء میں کہا تھا۔ اس کے بعد دیکھئے تو حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے۔ نہ صرف یہ کہ ہم

(۱)، (۲) یہ سنہ ۱۹۶۷ء کی بات ہے۔ اب یہ تحریک بعونہٖ تعالیٰ اور بھی زیادہ پھیل چکی ہے۔ (طلوعِ اسلام)

نے نظامِ تعلیم میں کوئی انسانیت ساز تبدیلی نہیں کی، بلکہ اب حالت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ ہماری درسگاہیں ہنگامہ آرائیوں اور فساد انگیزیوں کے اکھاڑے بن رہی ہیں۔ پہلے ہنگامہ آرائیاں دست و گریبانی تک محدود ہوتے تھے، اب بات بات میں گولیاں چل جاتی ہیں ——— کس بات پر گولیاں؟ ——— کسی پروفیسر نے کسی طالب علم کی بدتمیزی کا نوٹس لیا تو یا تو وہیں کلاس روم میں، اور یا کمرے سے باہر نکلتے ہی بے چارہ گولی کا نشانہ بن گیا۔ کسی استاد نے کسی نالائق طالب علم کو ایک پرچہ میں فیل کر دیا تو اسے سٹین گن کا نشانہ بنا دیا ——— نتیجہ اس کا یہ کہ کالجوں کے پرنسپل سہمے سہمے پھرتے ہیں اور اساتذہ دبکے دبکے جان بچاتے۔ جو امن پسند طالب علم ان مفسدہ پردازوں کا ساتھ نہیں دیتے، ان کا جینا حرام ہو جاتا ہے۔ یہ ہنگامہ خیز طلبہ معاشرہ میں دندناتے پھرتے ہیں اور کوئی پوچھنے والا نہیں۔ ان حالات میں علم و عقل کا نام کون لے سکتا ہے، اور فکر و بصیرت کا ذکر کون کر سکتا! یہ ہیں وہ عناصر جن سے ہماری نئی قوم ترکیب پا رہی ہے۔

دوسری طرف، مذہب پرست طبقہ کو لیجئے۔ پہلے ان کے فیصلے فتاویٰ کی حیثیت رکھتے تھے جن پر وحیٔ خداوندی کی روشنی میں علم و بصیرت اور دلائل و براہین کی رُو سے تنقید بھی کی جا سکتی تھی اور انہیں مسترد بھی کیا جا سکتا ——— لیکن اب وہی فتاویٰ عدالتوں کے فیصلوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں جن پر تنقید کرنے والا توہینِ عدالت کے جرم کا مرتکب قرار پا جاتا ہے۔ لہٰذا، فکر و تدبّر کے دروازے زندگی کے اس گوشے میں بھی بند ہیں۔ اگر ان کے کسی فتوے نے ہنوز قانون کی حیثیت یا عدالتی فیصلہ کی شکل اختیار نہیں بھی کی، تو بھی اس پر تنقید کرنے کی بہت کم لوگ ہمت پاتے ہیں۔ ان کے بے پناہ پراپیگنڈہ کا حریف بمشکل ہوا جا سکتا ہے۔

جس معاشرہ کی حالت یہ ہو، سوچئے کہ اس میں فکر و تدبّر کی گنجائش کہاں ہو سکتی ہے؟ اس کا نتیجہ کیا ہوگا، اس کے لئے، اقبالؒ کے ان الفاظ کا دُہرا دینا کافی ہوگا جو انہوں نے سنہ ۱۹۳۲ء میں کہے تھے کہ ——— "جن قوموں میں فکر مفقود ہو جاتی ہے، وہ تباہ ہو جاتی ہیں!"

اللہ تعالیٰ ہمیں اس روزِ بد سے محفوظ رکھے!

نظامِ ربوبیّت

(یہ پہلے ایڈیشن سے کہیں مختلف ہے)

آپ ایک عرصہ سے سنتے چلے آ رہے ہیں کہ اسلام، نہ نظامِ سرمایہ داری کا حامی ہے نہ کمیونزم کا۔ اس کا اپنا منفرد معاشی نظام ہے۔ جس میں نوعِ انسان کی مشکلات کا حل مضمر ہے۔ لیکن کسی نے یہ نہ بتایا کہ اسلام کا وہ معاشی نظام ہے کیا؟

مفکرِ قرآن، پرویز صاحب کی اس تصنیف میں نہایت وضاحت سے بتایا گیا ہے کہ

(۱) نظامِ سرمایہ داری کیا ہے۔ کمیونزم اور سوشلزم کے نظام کیا ہیں۔ اور یہ کیوں ناکام ہو گئے ہیں اور ان کے برعکس (۲) اسلام کا وہ معاشی نظام کیا ہے جو نوعِ انسانی کی مشکلات کا اطمینان بخش حل پیش کرتا ہے ——— اس کتاب کے بعد آپ کو معاشیات کے موضوع پر کسی اور کتاب کی ضرورت نہیں رہتی۔

✱ کتاب آفسٹ کی چھپائی میں عمدہ آرٹ پیپر سفید کاغذ پر طبع ہوئی ہے ——— ضخامت ساڑھے چار سو صفحات ——— سنہری جلد ——— قیمت فی جلد پچاس روپے علاوہ محصول ڈاک

سلیم کے نام

پرویز صاحب نے شروع ہی سے، اپنی قرآنی فکر و پیغام کا اولین مخاطب، قوم کے نوجوان، تعلیم یافتہ طبقہ کو قرار دیا ہے کیونکہ (بقول ان کے) اسی طبقہ کے بگڑنے سے قوم بگڑتی ہے اور اسی کے سنورنے سے سنورتی۔ اس طبقہ کے قلب و دماغ میں صحیح انقلاب پیدا کرنے کے لئے انہوں نے ایک سنجیدہ، شگفتہ، دلآویز سلسلہ شروع کیا جسے "سلیم کے نام خطوط" سے تعبیر کیا گیا۔ ان خطوط نے فی الواقعہ قوم کے نوجوان طبقہ کی ذہنیت بدل دی۔

پرویز صاحب، صاحبِ طرز فکر نگار ہیں۔ ان کی کسی تحریر کا کوئی ٹکڑا کہیں مل جائے، ان کے اندازِ نگارش سے واقف فوراً پہچان جائیں گے کہ یہ اُن کا قلم ہے۔ لیکن اِن خطوط میں ان کا انداز بالکل مختلف ہے۔ یہ ایسا ہے جیسے ایک مشفق باپ اپنے ہونہار، عزیز بچوں سے باتیں کر رہا ہو۔ اسی لئے ان کے یہ خطوط نوجوان طالب علموں کے دل میں اُتر جاتے ہیں۔

اس سلسلہ کی تین جلدیں ہیں،
جن کی قیمت حسبِ ذیل ہے:

- جلد اوّل ———— ۲۵/- روپے
- جلد دوم ———— ۱۵/- روپے
- جلد سوم ———— ۱۵/- روپے

(علاوہ محصول ڈاک)

ملنے کا پتہ:

(۱) ادارہ طلوع اسلام ۲۵-بی گلبرگ ۲۔ لاہور ۱۱ (۲) مکتبہ دین و دانش چوک اُردو بازار لاہور

اور کرو قرآن کی باتیں!

طلوعِ اسلام لاہور کی اشاعت بابت اگست ۱۹۸۲ء میں، پرویز صاحب کا ایک خطاب شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے ——— قرآن اور سائنس ——— اگر اس خطاب کے مندرجات آپ کے ذہن میں مستحضر ہیں تو فبہا۔ ورنہ (ہم گذارش کریں گے کہ) آپ ایک مرتبہ اس کا مطالعہ پھر کر لیجئے۔ اس خطاب کا حاصل یہ ہے کہ قرآن کریم تسخیرِ کائنات پر بڑا زور دیا ہے اور مومنین کی ایک خصوصیت یہ بتائی ہے کہ وہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کرکے، انہیں اقدارِ خداوندی کے مطابق عالم گیر انسانیت کی منفعت کے لئے صرف میں لاتے ہیں۔ اس سے ان کی یہ دنیا بھی درخشندہ ہو جاتی ہے اور اُخروی زندگی بھی تابناک۔

اس کے بعد (ہم پرویز صاحب سے بصد معذرت یہ کہنے کی جرأت کرتے ہیں کہ) "ان کی جو شامت آئی" تو انہوں نے سورۂ فاطر کی آیات (۲۸ تا ۳۵) درج کرنے کے بعد لکھ دیا کہ

آپ غور کیجئے کہ جن لوگوں کو قرآنِ کریم نے علماء کہا ہے کیا وہ وہی نہیں جنہیں دورِ حاضرہ کی اصطلاح میں سائنٹسٹ کہا جاتا ہے۔

اس پر "علماء حضرات" کا ردِ عمل کیا ہوا ہے اس کا اندازہ اس سراسیمگی سے لگ سکتا ہے جس کا مظاہرہ ماہنامہ "محدث" لاہور کی اشاعت بابت ستمبر ۱۹۸۲ء میں شائع ہونے والے اس شذرہ میں ہوا ہے جس کا عنوان ہے ——— احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسر ——— اس شذرہ کے مندرجات سے قطع نظر، جو زبان اس میں استعمال کی گئی ہے وہ خاص طور پر قابلِ ملاحظہ ہے۔ یہ حضرات اپنے آپ کو "انبیاء کا وارث" قرار دیا کرتے ہیں۔ سوچئے کہ کیا حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کا ورثہ اس نہج کا ہوگا؟

ہم اس قسم کی تحریروں سے طلوعِ اسلام کے صفحات کو آلودہ کرنا مناسب نہیں سمجھا کرتے۔ لیکن اس شذرہ کو اس لئے شائع کر رہے ہیں کہ

(۱) اس سے ایک تو ان حضرات کی ذہنیت آپ کے سامنے آجائے گی۔

(۲) دوسرے، جب طلوعِ اسلام میں شائع ہونے والے خطاب کا مطالعہ، اس شذرہ کو مدِ مقابل رکھ کر کیا جائے گا تو اس خطاب کی اہمیت اور نمایاں ہو کر سامنے آجائے گی ——— کہ (غالب کے الفاظ میں) ؎

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے، آئینۂ بادِ بہاری کا

(۳) اور تیسرے، یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ یہ حضرات حقائق کو کس طرح مسخ کر کے پیش کرتے ہیں۔ تاکہ ان کے متأثرین تاریکی کے غاروں سے نکلنے نہ پائیں۔

اب وہ شذرہ ملاحظہ فرمائیے:۔

احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسّر

"ایک شخص کئی سال سے قلعۂ اسلام پر، اسلام ہی کے حصار میں رہ کر، مسلسل گولہ باری کر رہا ہے۔ "طلوعِ اسلام" کے نام پر غروبِ آفتابِ اسلام اس کی زندگی کی سب سے بڑی تمنا ہے ——— وہ قرآن کا سہارا لے کر قرآن سے کھیلتا، حدیث کی آڑ میں حدیث پر حملہ آور ہوتا، صحابہؓ سے محبت جتلا کر انہی کا مذاق اڑاتا، دین کی پناہ حاصل کر کے دین کی بنیادیں ہلاتا، اشتراکیت کی مذمت کر کے اشتراکیت ہی کا پرچار کرتا، مادیت پرستی سے دشمنی ظاہر کر کے مادیت کی راہ ہموار کرتا، مادیت اور روحانیت کے درمیان بظاہر قرآنی راہِ اعتدال کا حوالہ دے کر شریعت سے بیزاری کا اظہار کرتا، سائنس کے نام پر علماءِ دین کو رگیدتا، سائنسی علوم کے مقابلے میں علومِ دین کو ہیچ سمجھتا، تاریخ کو مسخ کرتا، آخرت کا تصور دلوں سے محو کرتا اور شعائرِ اسلام کی علی الاعلان تضحیک کرتا ہے ——— اتنا شاطر، اتنا چالاک، اس قدر ذہین لیکن اسی قدر بدباطن کہ آیاتِ قرآنی کے مختلف ٹکڑے چنتا، ان کو ایک خاص ترتیب دے کر اس خوبی سے ان کو باہم مربوط کرتا اور ان کو خوشنما معانی پہنا کر من مانے مطالب اخذ کرتا ہے کہ مفہوم کچھ سے کچھ ہو جائے، لیکن قاری الفاظ اور تراکیب میں الجھ کر رہ جائے اور تحریر کے تسلسل اور روانی کے سحر کا شکار ہو کر اپنے ذہن کو منجمد ہوتا محسوس کرے، حتیٰ کہ یہ بھی بھول جائے کہ قرآن مجید میں اس نے جو کچھ پڑھا تھا اور جس چیز کی طرف یہ کلامِ الٰہی اب تک اسے دعوت دیتا رہا ہے، وہ کیا تھی؟ ——— پھر اسے یہ احساس بھی نہیں ہو پاتا کہ اپنی تحریر میں جگہ جگہ اقبالؒ کے اشعار کو فٹ کرنے والا یہ شخص خود ہی اس اقبالؒ کو بھی نظرانداز کر چکا ہے جس نے کہا تھا کہ ؎

احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسّر تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پاژند

(۰)

فاران کی چوٹیوں پر آفتابِ رسالت چمکا، تاریکیاں چھٹنے لگیں اور رفتہ رفتہ ظلمت کدۂ عالم منوّر ہونے لگا ——— شمعِ رسالت کے پروانوں نے "وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ" کی صدائے قرآنی سنی تو بے اختیار لپکے اور قرآن سیکھنے کے لئے اس نبیٔ اُمّیؐ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کر دیئے ——— "سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ" کے مصداق شمعِ رسالت کے یہ وہی پروانے تھے جو "وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى" کی صداقتوں سے آشنا ہو چکے تھے اور ایک عالم جنہیں اصحابُ رسول اللہ کی حیثیت سے جانتا ہے ——— قرآن ترجمانِ نبوت تھا اور زبانِ نبوت ترجمانِ

قرآن ـــــ سفر و حضر میں رسول اللہ کے یہ ساتھی، آپؐ کے ہر عمل کو نوٹ کرتے رہے اور آپؐ کی زبان مبارک سے نکلنے والے ایک ایک لفظ کو اپنے سینوں میں محفوظ کرتے رہے، تا آنکہ قرآن کے الفاظ میں "اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا" کی خوش خبری مل ـــــ صحابہ کرامؓ نے اپنے سینوں تک محفوظ امانت کو محدثین کے سپرد کر دیا، جنہوں نے اس خزانۂ عامرہ کو پوری چھان بین کے بعد سفینہ، قرطاس پر منتقل کر دیا جو آج تک مسلمانوں کے پاس محفوظ ہے اور تا قیامت محفوظ رہے گا۔ ان شاء اللہ!

اعدائے اسلام نے احادیث کے اس چشمۂ صافی کو مکدّر کرنے کی کوشش بے شک کی، لیکن محدّثین نے نہ صرف ان کوششوں کو ناکام بنایا، بلکہ ایک ایک حدیث کو جانچنے اور پرکھنے کے لئے ایسے ٹھوس قواعد تلاش کئے کہ آج چودہ سو سال بعد بھی، کسی بھی حدیث کو ان قواعد کی روشنی میں پرکھا جا سکتا ہے کہ یہ کلام، زبانِ ترجمانِ قرآن سے نکلا ہے یا نہیں؟ ـــــ ان چودہ صدیوں کے دوران نئے نئے افکار ابھر کر سامنے آتے رہے اور مختلف فتنے نمودار ہوئے لیکن کتاب و سنّت کی آہنی چٹان سے ٹکرا ٹکرا کر پاش پاش ہوئے اور بالآخر اپنی موت آپ مر گئے ـــــ آئندہ بھی یہی ہوتا رہے گا!

اختلافات کی بات چھوڑیئے، لوگوں نے حدیثِ رسول اللہ کے علاوہ قرآنِ مجید کو بھی معاف نہیں کیا اور جس کا ایک زندہ ثبوت وہی شخص ہے جس کا اوپر ہم نے ذکر کیا اور جس کے افکار عنقریب ہمارے زیرِ بحث آنے والے ہیں ـــــ بہرحال صحیح العقیدہ مسلمانوں کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ اسلام کے دو بڑے ماخذ یہی کتاب و سنّت ہیں، اور پیش آمدہ مسائل، جن کے بارے میں کوئی صریح نص کتاب و سنّت سے نہیں ملتی، کتاب و سنّت کی روشنی میں ان کا حل تلاش کیا جا سکتا ہے!

لیکن گلبرگ لاہور سے چند برس پیشتر جو اسلام طلوع ہوا ہے (اور جس سے اس اسلام کے بانی کی نظر میں خلافتِ راشدہ کے بعد سے لے کر اس نئے اسلام کے طلوع ہونے تک (یا کم از کم ہندوستان میں سرسیّد کے افکار کے منظرِ عام پر آنے تک) پوری اُمّتِ مسلمہ محروم رہی ہے۔ اس کا تو "باوا آدم ہی نرالا" ہے ـــــ اور یہ بات ہم نے صرف محاورتاً نہیں کہی، یہ شخص واقعتاً حضرت آدمؑ کو اپنے محسنِ اعظم سرسیّد کی طرح، ایک مخصوص فرد تسلیم کرنے سے انکاری ہے۔ چنانچہ اس کی کتاب "مطالب[1] القرآن" جلد چہارم کے صفحہ ۲۷۴ پر "یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا" کا ترجمہ یوں درج ہے کہ:

> "اے نوعِ انسان! اپنے نشو و نما دینے والے کے قانون کی نگہداشت کرو جس نے، تمہاری پیدائش کی ابتدا ایک جرثومہ زندگی سے کی، ازاں بعد یہ جرثومہ دو حصّوں میں تقسیم ہو گیا، جس سے نر و مادہ کی تقسیم وجود میں آئی!"

---

[1] مطالب القرآن نہیں - مطالب الفرقان - (طلوع اسلام)

آئندہ سطور میں ہمارے زیرِ بحث آنے والے اس کے مضمون (قرآن اور سائنس) میں مندرجہ بالا آیتِ قرآنی اور اس سلسلہ میں وارد حدیث کا مذاق اس شخص نے یوں اڑایا ہے کہ:

"..... یہ نتیجہ ہے اس مذہبی تعلیم کا جس کی رُو سے آپ انہیں (نئی نسل کو) بتاتے ہیں کہ بابا آدم کی پسلی چیر کر اس میں سے اس کی بیوی نکالی گئی تھی ——— وہ اس مذہب سے متنفر نہ ہوں گے تو کیا اسے گلے سے لگائیں گے؟" (طلوعِ اسلام اگست ۱۹۸۲ء ص ۵۵)

الغرض گلبرگ سے اس نئے طلوع ہونے والے "اسلام" نے وُہ وُہ شعبدے دکھائے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے ——— بالخصوص قرآنِ مجید کو جس بے دردی سے نشانہ رستم بنایا گیا ہے، اس کی مثال کہیں نہیں ملتی ——— آج ہمیں چند اہنی شعبدہ بازیوں کی حقیقت کو بے نقاب کرنا ہے۔

(۰)

"طلوعِ اسلام" شمارہ اگست ۱۹۸۲ء کا ایک مضمون "قرآن اور سائنس" اس وقت ہمارے پیشِ نظر ہے جو دراصل "تقریب جشنِ نزولِ قرآن" کے سلسلہ کا ایک خطاب ہے۔ اس کے صفحہ ۴۶، ۴۷ پر اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ" کے تحت لکھا ہے:۔

"حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ عقل و بصیرت سے کام لیتے ہیں، ان کے لئے تخلیقِ کائنات اور گردشِ لیل و نہار میں قانونِ خداوندی کی حقیقت اور ہمہ گیری کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں، ان صاحبانِ عقل و بصیرت اور اربابِ فکر و نظر کے لئے جو زندگی کے ہر گوشے میں، کھڑے بیٹھے لیٹے قوانینِ خداوندی کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتے ہیں اور کائنات کی تخلیقی ترکیب پر غور و فکر کرتے رہتے ہیں اور اپنی تحقیقات اور انکشافات کے بعد علیٰ وجہ البصیرت پکار اُٹھتے ہیں کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو نے اس کارگہِ کائنات کو نہ تو عبث و بے کار پیدا کیا ہے اور نہ ہی تخریبی نتائج پیدا کرنے کے لئے، تیری ذات اس سے بہت بلند ہے کہ تو اتنے عظیم نظام کو بلا مقصد پیدا کر دے۔ یہ ہماری کم علمی اور کوتاہ نگہی ہے کہ ہم تحقیق سے کام نہیں لیتے اور اس طرح اشیائے کائنات کے نفع بخش پہلوؤں سے بے خبر رہ کر عذاب کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ تو ہمیں توفیق عطا فرما کہ ہم علمی تحقیقات اور عملی تجربات کے بعد عناصرِ کائنات سے صحیح صحیح فائدہ اٹھائیں اور اس طرح تباہ کن عذاب کی زندگی سے محفوظ رہیں"!

بتائیے، کیا اس پوری عبارت میں آخرت کا کوئی تصوّر موجود ہے؟ آپ نے غور فرمایا کہ اللہ رب العزّت کی عظمت کے بیان کے پس پردہ کیا فریب دیا جا رہا ہے؟ ——— "تو ہمیں توفیق عطا فرما کہ ہم علمی تحقیقات اور عملی تجربات کے بعد عناصرِ کائنات سے صحیح صحیح فائدہ اٹھائیں اور اس تباہ کن عذاب کی زندگی سے محفوظ رہیں" ——— یہ الفاظ لکھ کر قرآنی مفہوم کی آڑ میں مادیت کو کشید کرنے کی کتنی بھرپور اور شرمناک کوشش کی گئی ہے حالانکہ قرآنِ مجید نے انسانی زندگی کا مقصد کہیں یہ قرار نہیں دیا کہ محض علمی تحقیقات اور عملی تجربات کے بعد عناصرِ کائنات سے

صحیح صحیح فائدہ اٹھایا جائے۔ یہ انسانی زندگی بسر کرنے کا ایک ذریعہ تو ہو سکتا ہے، اسے مقصد ہرگز نہیں قرار دیا جا سکتا ـــــ بلکہ اس کے برعکس انسانی زندگی کا مقصدِ تخلیق رب العزت نے "اپنی عبادت" قرار دیا ہے:

"وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ!"

لیکن اگر انسانی زندگی کا مقصد یہی ہے جو "طلوعِ اسلام" نے قرار دیا ہے تو سوال یہ ہے کہ ایسے اسلام کو طلوع ہونے کی ضرورت بھی کیا تھی؟ اس مقصد کے حصول کے لئے تو پہلے ہی سر توڑ کوششیں جاری ہیں اور یادِ خدا اور فکرِ آخرت کی ثانوی حیثیت بھی باقی نہیں رہی اور جس کے باعث انسانی زندگی عذاب بن کر رہ گئی ہے ـــ عذاب تو یہی ہے کہ انسانی زندگی نے اب علمی تحقیقات اور عملی تجربات کے بعد عناصرِ کائنات سے صحیح صحیح فائدہ اٹھا لینے ہی پر کمرِ ہمت باندھ لی ہے، تو پھر جس عذاب کی زندگی کی بات "طلوعِ اسلام" نے کی ہے وہ کونسی زندگی ہے؟ کیا اس کے نزدیک عذاب کی زندگی یہ ہے کہ انسان اپنے خالقِ حقیقی کو پہچان کر اس کے سامنے سرِ عبودیت خم کر دے اور "اَلدُّنْيَا مَزْرَعَةُ الْاٰخِرَةِ" کے تحت اپنی زندگی خدا تعالےٰ اور اس کے رسولؐ کے بتائے ہوئے طریقوں کے تحت بسر کرنے لگے ـــــ اور اگر فرمانِ رسول اللہؐ اسے راس نہیں آتا کہ اس سے اسے ازلی بیر ہے تو ہم قرآن کی زبان میں "لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا!" کے الفاظ ذکر کئے دیتے ہیں ـــــ لیکن "مطالب القرآن" کے انیسویں پارے میں نامعلوم اس آیت کا بھی کیا حشر ہوگا!

کیا اسی برتے پر یہ کہا جا رہا ہے کہ

"وہ (نئی نسل) اس مذہب (اسلام) سے متنفر نہ ہوں گے تو کیا اسے گلے سے لگائیں گے؟"

مسلمان واقعی اسلام کو گلے لگا لینے کے لئے بیتاب ہے، لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ چودھویں صدی کا ایک مفسرِ قرآن اس مادی دور میں مادیت کی راہ ہموار کرنے کے لئے قرآن ہی سے سندِ جواز عطا فرما رہا ہے اسی قرآن سے، جس نے یہ فرمایا ہے:

"زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ط ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ط وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ. قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ط لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّ رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ط وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِالْعِبَادِ" (آلِ عمران: ۱۴، ۱۵)

قرآن مجید نے جہاں کہیں بھی اپنی قدرتوں اور کائنات میں غور و فکر کا ذکر فرمایا ہے، اس سے اس کا مقصود توحیدِ ربوبیت کا حوالہ دے کر توحیدِ الوہیت، اعمالِ صالحہ اور آخرت پر استدلال ہے۔ قرآنِ مجید میں ایسی بے شمار آیات موجود ہیں۔ مثلاً سورۂ آلِ عمران کی یہی مندرجہ بالا آیت، یا وہی آیت جس کے تحت ہم نے طلوعِ اسلام

کا طویل اقتباس نقل کیا ہے، یہ دراصل دو آیات کی تفسیر ہے۔ پہلی آیت یوں ہے:

"اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ"

اس کے بعد کی آیت میں فرمایا:۔

"اَلَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ"

اس آیت کو پڑھئے اور مذکورہ بالا اقتباس کو دیکھئے جو اگرچہ کافی طویل ہے لیکن "یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ" (ذکرِ الٰہی) کا کہیں ذکر تک نہیں کیا بلکہ اس کی بجائے "یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ" کے تحت یہ لکھا ہے کہ:

"وہ کھڑے، بیٹھے، لیٹے قوانین خداوندی کو اپنی آنکھوں کے سامنے رکھتے ہیں"

اسی لئے پوری آیت درج نہیں کی گئی کہ مبادا اس طرح کتمانِ حق کا بھانڈا عین چوراہے میں پھوٹ جائے چنانچہ اس کا رُخ دوسری طرف پھیر دیا گیا تاکہ اس سے سائنس کشید کی جا سکے کیونکہ موضوع (قرآن اور سائنس) تو بہرحال انہیں نبھانا ہی تھا۔

پھر یہ بھی دیکھئے کہ آیتِ کریمہ میں "رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا" (کہ "اے اللہ! تو نے اس کائنات کو عبث پیدا نہیں فرمایا) کے معاً بعد "سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ" کے الفاظ وارد ہیں ـــــ لیکن بجائے اس کے کہ تفسیر کرتے وقت آیت کے اصل مقصود کو پیشِ نظر رکھا جاتا ہے صاحبِ تفسیر "تیری ذات اس سے بہت بلند ہے کہ تو اتنے عظیم نظام کو بلا مقصد پیدا کر دے" لکھنے کے بعد اچانک ہتھے سے اکھڑ گئے ہیں کہ

"یہ ہماری کم علمی اور کوتاہ نگہی ہے کہ ہم تحقیق سے کام نہیں لیتے اور اس طرح اشیائے کائنات کے نفع بخش پہلوؤں سے بے خبر رہ کر عذاب کی زندگی بسر کرتے ہیں ـــــ تو ہمیں توفیق عطا فرما کہ ہم علمی تحقیقات اور عملی تجربات کے بعد عناصرِ کائنات سے صحیح صحیح فائدہ اٹھائیں اور اس طرح تباہ کن عذاب کی زندگی سے محفوظ رہیں!"

ملاحظہ فرمایا آپ نے، بات کہاں سے کہاں جا پہنچی ہے، رب العزت نے یہ آیت ذکر فرما کر مومنوں کو عذابِ جہنم سے بچ جانے کی ترغیب دی ہے اور اسی سلسلہ میں چند دعائیہ الفاظ (سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ) بھی ذکر فرما دیئے ہیں، لیکن صاحبِ تفسیر کے سر پر سائنس بُری طرح سوار ہے۔ پھر خط کشیدہ الفاظ میں "عذابِ نار" کو جس طرح گول مول کیا ہے اس پر بھی بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے، جبکہ جہنم اور اس کا عذاب ایک اٹل حقیقت ہیں اور اس سلسلہ میں قرآن مجید میں کافی تفصیلات وارد ہیں، لیکن صاحبِ تفسیر کے نزدیک "عذابِ نار" سے مراد ایسی زندگی ہے جو کہ علمی (سائنسی) تحقیقات اور عملی تجربات

کے بعد عناصرِ کائنات سے صحیح صحیح فائدہ اٹھانے" سے خالی ہو۔ ؏
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے!

قرآنِ مجید کا یہ مقام ملاحظہ ہو، آیت نمبر ۱۹۰ تا ۲۰۰ (آخر سورۂ آلِ عمران تک) تمام کی تمام فکرِ آخرت کی دعوت دے رہی ہیں بلکہ آیات ۱۹۶، ۱۹۷ تو خاص اسی سلسلہ کی کڑی ہیں جن کے ذریعہ ہم نہ صرف اپنے مضمون کو آگے بڑھا سکتے ہیں بلکہ "طلوعِ اسلام" کے اس زیرِ بحث مضمون کے لئے ہمیں ان کی ضرورت بھی ہے، ارشادِ ربانی ہے:-

"لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي الْبِلَادِ- مَتَاعٌ قَلِيلٌ ثُمَّ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمِهَادُ!"

لیکن صاحبِ مضمون "طلوعِ اسلام" کے اسی صفحہ ۴۷ پر سورۂ فاطر کی آیت ۲۷، ۲۸ کے تحت عجائباتِ قدرت کا ذکر کرتے ہیں (اور ان آیات سے بھی وہی مفہوم اخذ کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو ان کے مزعومہ مقصد کے متعلق ہے جبکہ یہ آیات بھی فکرِ آخرت کے موضوع پر دلالت کرتی ہیں چنانچہ آخر رکوع (آیت ۳۸) تک تمام آیات اسی فکر سے بھرپور ہیں جن میں جنّت و جہنّم کا تفصیل ذکر بھی کیا گیا ہے) ـــــ اور اس کے بعد "علماء کون ہیں؟" کا عنوان قائم کرکے آیت "إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ" کے تحت لکھتے ہیں:-

"آپ غور کیجئے کہ جن لوگوں کو قرآنِ کریم نے علماء کہا ہے، کیا وہ وہی نہیں جنہیں دورِ حاضرہ کی اصطلاح میں سائنٹسٹ کہا جاتا ہے"

صاحب! ہم تو یہ دیکھ رہے ہیں کہ جوں جوں سائنسی نظریات پھیل رہے ہیں، دنیا خدا سے اسی قدر بے خوف ہوتی جارہی ہے اور خود آپ کے ان علماء (سائنٹسٹ حضرات) کا حال پوچھنا چاہو تو ان ممالک کی معاشرتی زندگی کا ایک جائزہ لے ڈالو، جن میں یہ علماء "پلے بڑھے اور جوان ہوئے ہیں اور جو اس وقت سائنسی علوم میں ترقی حاصل کرکے پوری دنیا کو پیچھے چھوڑ چکے ہیں ـــــ اس کے لئے ہمیں خود سے کوئی ثبوت پیش کرنے کی ضرورت نہیں، آپ کے اسی "طلوعِ اسلام" کے ص ۴۳ پر آپ کی اپنی عبارت موجود ہے کہ

"لوط کی قوم، پوری کی پوری، اس قسم کی شنیع حرکت کی مرتکب کیسے ہوگئی، لیکن اب یہ بات چنداں وجہ حیرت نہیں رہی۔ قومِ لوط کی سرگذشت آج سے چار ہزار سال پہلے کے دورِ جہالت سے متعلق ہے، آج اس بیسویں صدی کے زمانہ علم و بصیرت میں دنیا کی سب سے بڑی مہذب اور متمدّن قوم، برطانیہ نے وہ قانون پاس کیا ہے جس کی رُو سے لواطت (HOMO - SEXUALITY) کو جرائم کی فہرست سے خارج کردیا گیا ہے"

واضح رہے کہ ہم سائنسی علوم و تحقیقات کے خلاف نہیں ہیں لیکن ہم قرآنِ مجید کو محض سائنس کی ایک کتاب قرار دینے کے بہرحال مخالف ہیں!

اور خاشیہ میں اسی ضمن میں یہ عبارت بھی موجود ہے:-

"امریکہ سے بھی اس قسم کی اطلاعات موصول ہو رہی ہیں کہ وہاں لڑکوں (اغلام) کی باقاعدہ خرید و فروخت ہوتی ہے"!

کیا خوب! سچ۔

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے!

آپ ہی بتایئے، کیا "اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمَاءُ" کی یہی تفسیر ہے جس پر آپ کو فخر ہے، جس کی طرف آپ دنیا کو دعوت دے رہے ہیں، اور عناصرِ کائنات سے صحیح صحیح فائدہ اٹھانے کا بھی وہ مفہوم ہے جو اوپر آپ نے درج کیا ہے۔ ہمیں وہی آیات پڑھنے دیجئے جن سے ہم نے اپنے سلسلہ تحریر کو آگے بڑھایا ہے:

"لَا یَغُرَّنَّکَ تَقَلُّبُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فِی الْبِلَادِ۔ مَتَاعٌ قَلِیْلٌ ثُمَّ مَاْوٰھُمْ جَھَنَّمُ وَبِئْسَ الْمِھَادُ!"

چنانچہ آپ خود ہی ملاحظہ فرما لیجئے، آپ کے ان سائنٹسٹ حضرات کا کیا حشر ہونے والا ہے؛ ——
آپ نے اپنے اسی مضمون کے ص ۵۲ پر بخاری شریف کی چند احادیث کا مذاق اڑا کر ان احادیث کو ماننے والوں کی توہم پرستی کا ذکر بھی کیا ہے۔ آپ کو یہ کون بتائے کہ یورپ کی یہ ترقی یافتہ اقوام جن کی ذہنی غلامی کا آپ بُری طرح شکار ہیں، آج بھی اپنے گلے میں صلیب لٹکائے پھرتی ہیں!"

اس کے بعد، خطاب کے اس حصے کو کندۂ قصاب بنایا گیا ہے جس میں لیلۃ القدر کی عظمت بیان ہوتی ہے۔ چونکہ اس بحث کا تعلق علومِ سائنس سے نہیں اس لئے ہم اسے حذف کر کے آگے بڑھتے ہیں۔ شذرہ میں مرقوم ہے:-

تاہم خدا کا شکر ہے کہ اس مقام پر پہنچ کر انہوں نے اپنے موضوع "قرآن اور سائنس" کو معاف کر دیا ہے اور یہ اعتراف کیا ہے کہ

یہ نورانیت سب سے پہلے (عہدِ) محمد رسول اللّٰہ والذین معہٗ میں وجہ تابانی عالم ہوئی تھی جس سے زندگی کے تاریک سے تاریک تر گوشے بھی چمک اٹھے تھے۔

لیکن اس کے فوری بعد یہ ارشاد ہوا کہ

"دراصل یہ بھی ایک فریب ہے، کہ اگر "وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ" سے بظاہر عقیدت کا اظہار نہ کیا جائے اور ان کے دور کی نورانیت کو تسلیم نہ کیا جائے تو مسلمانوں کو فریب دینے کے لئے ان کے پاس اور باقی بھی کیا رہ جاتا ہے؛ ورنہ کون نہیں جانتا کہ یہ حضرت اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کی راہ میں جس چیز کو سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتے ہیں اور جس سے یہ انتہائی "الرجکس" ہیں، وہ انہی "وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ" کے منہ سے ہر وقت جھڑنے والے "قال اللّٰہ و قال الرسول" کے پھول ہیں اور جن سے ان کو خدا واسطے کا بیر ہے —— اپنے اسی مضمون میں "طلوعِ اسلام" کے ص ۵۱، ۵۲ پر انہوں نے جامع

ترمذی کی ایک اور بخاری شریف کی تین روایات کا ان الفاظ میں مذاق اڑایا ہے،

"اگر یہ وضعی روایات احادیث کے مجموعوں میں ہی محفوظ رہتیں تو بھی ان توہم پرستیوں کا دائرہ محدود رہتا لیکن اس کے بعد یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ قرآنِ مجید کی بھی وہی تفسیر قابلِ اعتماد ہے جو نبی اکرمؐ نے ارشاد فرمائی ہے اور یہ وہ تفسیر ہے جو ان روایات کی بنیادوں پر مرتب ہوتی ہے۔ یہ تفسیر کس قسم کی ہوتی ہے، میں اس کا صرف ایک نمونہ پیش کرنے پر اکتفا کروں گا!"

اور اس کے بعد تفسیر ابن کثیر کی ایک روایت کا تمسخر اڑایا ہے ——— ہم ان مذکورہ احادیث اور ابنِ کثیر کی اس روایت پر تو کسی آئندہ مجلس میں گفتگو کریں گے کہ بات پہلے ہی کافی طویل ہو چکی ہے اور مزید طوالت کے لئے "فکر و نظر" کے یہ صفحات متحمل نہیں ہو سکتے[1] ——— فی الحال "وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ" سے ان حضرات کی عقیدت کی داستان سنیئے:۔

صفحہ ۵ پر "یُخْرِجُھُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَی الظُّلُمٰتِ" کے تحت لکھتے ہیں:۔

"اس کے برعکس طاغوتی طاقتوں کا یہ حربہ بتایا تھا کہ وہ انہیں روشنی سے تاریکی کی طرف لے جائیں گی! ——— ان قوتوں نے یہی حربہ استعمال کیا اور اس کے لئے انہیں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ انہوں نے کچھ روایات وضع کیں اور انہیں احادیثِ رسول اللہؐ کے نام سے مشہور کر دیا اور ان کے متعلق عقیدہ یہ وضع کر دیا کہ ان کے انکار سے مسلمان دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے!"

"ہمیں یہ تسلیم کہ وضعی روایات کا وجود بھی اس دنیا میں پایا جاتا ہے لیکن بخاری شریف کے "اصح الکتب بعد کتاب اللہ" ہونے پر امتِ مسلمہ کا اتفاق ہے جس کی روایات کو آپ نے نشانۂ ستم بنایا ہے۔

آخر یہ تسلیم کرنے کی بھی تو کوئی تک نہیں کہ پوری امتِ مسلمہ میں سے صرف آپ اور صرف آپ کے "سر سید اعلی اللہ مقامہ" ہی قرآن کا صحیح مفہوم اخذ کر پائے ہیں اور پوری امتِ مسلمہ میں صرف آپ دونوں ہی سچے مسلمان پائے جاتے ہیں، اور آپ کے مقابلے میں "قرآنِ مجید کی وہ تفسیر بھی قابلِ اعتماد نہیں جو نبی اکرمؐ نے ارشاد فرمائی ہے" کہ اس کے قابلِ اعتماد ہونے کا عقیدہ آپ کے نزدیک وضعی ہے ——— بخاری شریف کی روایات انہی صحابہؓ ("وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ") کے ذریعے ہم تک پہنچی ہیں، جن کو آپ طاغوتی طاقتیں قرار دے رہے ہیں اور اپنی تفسیر کے مقابلے میں رسول اللہؐ کی تفسیر کو بھی ناقابلِ اعتماد سمجھ رہے ہیں ——— لعنۃ اللہ علی الکاذبین!"

اور اس کے بعد ملاحظہ فرمایئے طبیب کا نبض فرماتے ہیں:۔

"قارئین، یہ ہیں اس شخص کے عقائد، جن کا ایک مختصر سا جائزہ ہم نے آپ کے سامنے پیش کیا

---

[1] فوراً جرأت کر کے وہ روایات نقل ہی کر دیتے! (طلوعِ اسلام)

ہے ——— ہم واشگاف الفاظ میں کہتے ہیں کہ یہ شخص گستاخِ رسولؐ بھی ہے، گستاخِ صحابہؓ بھی ہے گستاخِ قرآن بھی ہے اور گستاخِ فرمانِ رسولؐ بھی ——— خود اس کے اپنے نام کے ساتھ "پرویز" کا لاحقہ اس کی رسولؐ دشمنی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اپنے تئیں مفسرِ عظیم ہونے کا دعویٰ کرنے والے اس شخص کو شاید یہ بھی معلوم نہیں کہ "پرویز" غلام احمد نہیں "گستاخِ احمدؐ" تھا جس نے حضورؐ کا نامہ مبارک چاک کر دیا تھا۔ ——— پس اگر قادیانی "ختمِ نبوت" سے انکاری ہو کر غیر مسلم ہیں تو یہ جو اسلام کے دائرہ میں پائی جانے والی ہر چیز کا انکار کر کے ایک نیا اسلام طلوع کر رہا ہے اور جس کا ثبوت اس کی اپنی ڈھیروں کتابیں ہیں، ——— یہ کہاں کا مسلمان ہے اور اسے اسلام کے خلاف زہر اگلنے کی کھلی چھٹی کیوں دی جا چکی ہے؟ ——— کیا اس لئے کہ یہ اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لئے "قرآنی نظامِ ربوبیت" کا نام استعمال کرتا ہے؟ ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ، رسول اللہؐ، قرآنِ مجید، حدیثِ رسولؐ، اصحابِ رسول اللہؐ، حتیٰ کہ پورے اسلام کے خلاف زہر اگلنے والی اس زبان کو خاموش کیا جائے، اس کی کتب کو ضبط کر لیا جائے اور اسے دائرۂ اسلام سے خارج کر دیا جائے!

وما علینا الا البلاغ!

(۰)

ہم اس شذرہ کا کوئی جواب نہیں دینا چاہتے ——— گالیوں کا جواب کیا دیا جا سکتا ہے؟ البتہ حقائق کو مسخ کر کے جس مغالطہ آفرینی کی سعیٔ مذموم کی گئی ہے اس کا ازالہ ضروری سمجھتے ہیں۔ اس میں تاثر یہ دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ:

(۱) پرویز صاحب، مغرب کے ملحد اور بے دین سائنس دانوں کو مومن کا مقام دے رہے ہیں۔

اور (۲) آخرت کے منکر ہیں۔

محدث نے، طلوعِ اسلام کے جس پرچہ (بابت اگست ۸۲ء) سے اقتباسات پیش کئے ہیں، اُسی میں مغرب کے لادینی نظام کے ضمن میں (پرویز صاحب کے) یہ الفاظ بھی موجود ہیں:-

اس سلسلہ میں قرآنِ کریم ایک اور عظیم حقیقت کو بھی سامنے لاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس قسم کا غلط نظام وہی قومیں اختیار اور رائج کرتی ہیں جن کا نظریۂ حیات یہ ہو کہ: اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا۔ وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ۔ (۲۳/۳۷) زندگی اسی دنیا کی زندگی ہے

حیاتِ آخرت سے انکار

موت سے انسان کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ حیاتِ آخرت اور اعمالِ انسانی کا محاسبہ، سب افسانہ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب انسان کا نظریۂ زندگی یہ ہو جائے تو پھر وہ کونسی چیز ہے جو اسے سلبِ نہب، لوٹ کھسوٹ اور غصب و استحصال سے روک سکے۔ نظامِ سرمایہ داری اسی تصورِ حیات کا فطری نتیجہ ہے۔ یا یہ تصورِ حیات اس نظام کا لازمی نتیجہ۔

اور یہی وجہ ہے کہ روس نے جب ایک طرف نظامِ سرمایہ داری کے خلاف آواز بلند کی اور

دوسری طرف حیاتِ آخرت سے انکار کیا تو علامہ اقبالؒ نے اسے وارننگ دی کہ یاد رکھو جس نظام کی طرف تم دعوت دیتے ہو، وہ اس تصورِ حیات کے ساتھ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس نظام کی بنیاد ہی ایمان بالآخرت ہے۔ یہ عمارت اسی بنیاد پر قائم رہ سکتی ہے۔

(صفحہ ۳۱ و ۳۲)

انہوں نے اپنے اسی خطاب (قرآن اور سائنس) میں لکھا ہے:۔

جو قومیں فطرت کی قوتوں کو مسخر کر لیتی ہیں، انہیں کس قدر قوت اور ثروت حاصل ہو جاتی ہے، اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن امتِ مسلمہ کے لئے یہ چیزیں، شرف و مجد کا صرف ایک پہلو ہیں۔ اس کی تکمیل اس وقت ہوتی ہے جب فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں قرآن کی ابدی اقدار کے مطابق صرف میں لایا جائے۔

(ص۸)

پرویز صاحب تسخیرِ کائنات کے موضوع پر مدت سے لکھتے چلے آ رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے مضمون "انسان اور خارجی کائنات" — کا خاتمہ ان الفاظ پر کیا ہے:۔

ہم نے شروع میں دیکھا ہے کہ قرآن نے کہا ہے کہ کائنات میں مومنین اور متقین کے لئے ہر جگہ آیات اللہ ہیں۔ اس سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ ایمان اور تقویٰ کے معنی اشیائے کائنات پر غور و فکر اور تحقیق و تدقیق ہے اور جو قومیں تسخیرِ فطرت کرتی ہیں وہ مومن اور متقی ہوتی ہیں۔ مومن و متقی

صرف تسخیرِ فطرت ایمان نہیں

وہ ہیں جو تسخیرِ فطرت کے بعد فطرت کی قوتوں کو قوانینِ خداوندی کے مطابق (نوعِ انسانی کی ربوبیتِ عامہ کے لئے) صرف کرتے ہیں اور اس طرح اپنی ذات کی نشوونما کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔ مومن ہونے کے لئے یہ دونوں شرطیں ضروری ہیں۔ یعنی تسخیرِ کائنات اور اتباعِ قوانینِ خداوندی جو قرآن کے اندر محفوظ ہیں۔ اگر کسی قوم میں ان دو شرطوں میں سے کسی ایک شرط کی بھی کمی ہے تو وہ مومن و متقی نہیں کہلا سکتی۔ وَمَنْ لَّمْ

مومن ہونے کی شرائط

يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ (۵/۴۴) "جو لوگ کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہ کافر ہیں"۔ جو قومیں تسخیرِ فطرت تو کر لیتی ہیں لیکن امورِ زندگی کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق نہیں کرتیں وہ بھی ان قوموں کی طرح تباہ و برباد ہو جاتی ہیں جو سرے سے تسخیرِ فطرت نہیں کرتیں۔ یہی وہ قومیں ہیں جن کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ: فَمَا أَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَا أَبْصَارُهُمْ وَلَا أَفْئِدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ إِذْ كَانُوا يَجْحَدُونَ (۴۶/۲۶) "ان کے سمع و بصر و فؤاد ان کے کسی کام نہ آئے کیونکہ وہ قوانینِ خداوندی سے انکار کرتے تھے وہ تباہ و برباد ہو گئے۔ لہٰذا، قرآن کی رُو سے صورتِ حال یوں ہوئی کہ (۱) جو قومیں سمع و بصر و فؤاد سے کام لے کر تسخیرِ فطرت کرتی ہیں اور پھر فطرت کی قوتوں کو

حاصلِ مبحث

قوانینِ خداوندی (قرآن) کے مطابق صرف کرتی ہیں، وہ مومن و متقی ہیں۔ ان کی اس دنیا کی زندگی بھی،

درخشندہ اور تابناک ہوتی ہے اور آخرت کی زندگی بھی خوشگوار و شاداب۔

(۲) جو قومیں تسخیرِ فطرت تو کرتی ہیں لیکن قرآن کی مستقل اقدار کا اتباع نہیں کرتیں وہ صرف مقامِ آدمیت تک پہنچتی ہیں۔ مومن و متقی کے مقام تک نہیں پہنچتیں وہ اس دنیا کی زندگی میں قوت و شوکت حاصل کرلیتی ہیں لیکن مستقبل ان کا تاریک ہوتا ہے۔

(۳) اور جو قومیں سرے سے تسخیرِ کائنات کرتی ہی نہیں، وہ مومن و متقی ہونا تو کجا، مقامِ آدمیت تک بھی نہیں پہنچ سکتیں۔ اُولٰٓئِكَ مَأْوٰىهُمُ النَّارُ۔ (۸/۱۰) ان کے لئے اس دنیا میں بھی ذلت و خواری ہے۔ اور آخرت میں بھی تباہی و بربادی۔ اس لئے کہ: مَنْ كَانَ فِىْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِى الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى (۱۷/۷۲) جو یہاں کا اندھا ہے وہ وہاں کا بھی اندھا ہے۔

وہ کل کے غم و عیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا
جو آج خود افروز و جگر سوز نہیں ہے!
وہ قوم نہیں لائقِ ہنگامۂ فردا
جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے

(سلسبیل۔ ص۶۲-۱۶۱)

اسی حقیقت کو انہوں نے اپنے اس مقالہ میں بھی دہرایا ہے جو "علماء کون ہیں؟" کے عنوان سے، طلوعِ اسلام بابت جولائی ۱۹۸۱ء (ص۶۲) میں شائع ہوا ہے۔

اس شخص کو آخرت کا منکر بتایا جاتا ہے!۔

پرویز صاحب آخرت کے منکر نہیں۔ وہ مذہبی پیشوائیت کے منکر ہیں۔ اور ان حضرات کے نزدیک، یہ انکار، خدا۔ وحی۔ رسالت۔ آخرت کے انکار سے بھی زیادہ سنگین جرم ہے جس کی سزا یہ ہے کہ اسے دائرۂ اسلام سے خارج کردیا جائے۔ اس جرم کا مرتکب اور اس سزا کا مستحق، تنہا پرویز نہیں جس کسی نے بھی قرآن کی بات کی اس کے متعلق ان کافرگر حضرات نے یہی کچھ کہا۔ اسی مقام پر اقبالؒ نے پکار کر کہا تھا کہ: ؎

گرفتم حضرتِ ملّا ترش روست
نگاہش مغز را نشناسد از پوست
اگر با ایں مسلمانی کہ دارم!
مرا از کعبہ می راند، حق اوست!
(ارمغانِ حجاز ص۱۱)

اسی کا نتیجہ ہے کہ: ؎

دینِ حق از کافری رسوا تر است
زانکہ ملّا، مومنِ کافر گر است
از شکر فیہائے آں قرآں فروش!
دیدہ ام روح الامیں را در خروش
زآنسوئے گردوں دلش بیگانۂ
نزدِ او امّ الکتاب افسانۂ!
بے نصیب از حکمتِ دینِ نبیؐ
آسمانش تیرہ از بے کوکبی!
کم نگاہ و کور ذوق و ہرزہ گرد
ملت از قال و اقولش فرد فرد
مکتب و ملّا و اسرارِ کتاب
کورِ مادر زاد و نورِ آفتاب
دینِ کافر فکر و تدبیرِ جہاد
دینِ ملّا فی سبیل اللہ فساد
(جاوید نامہ ص۴۴)

(۵)